POCKET BOOKS

MB 146

سعادت حسن منٹو

خالی ڈبے

خالی بوتلیں خالی ڈبے

افسانے

سعادت حسن منٹو

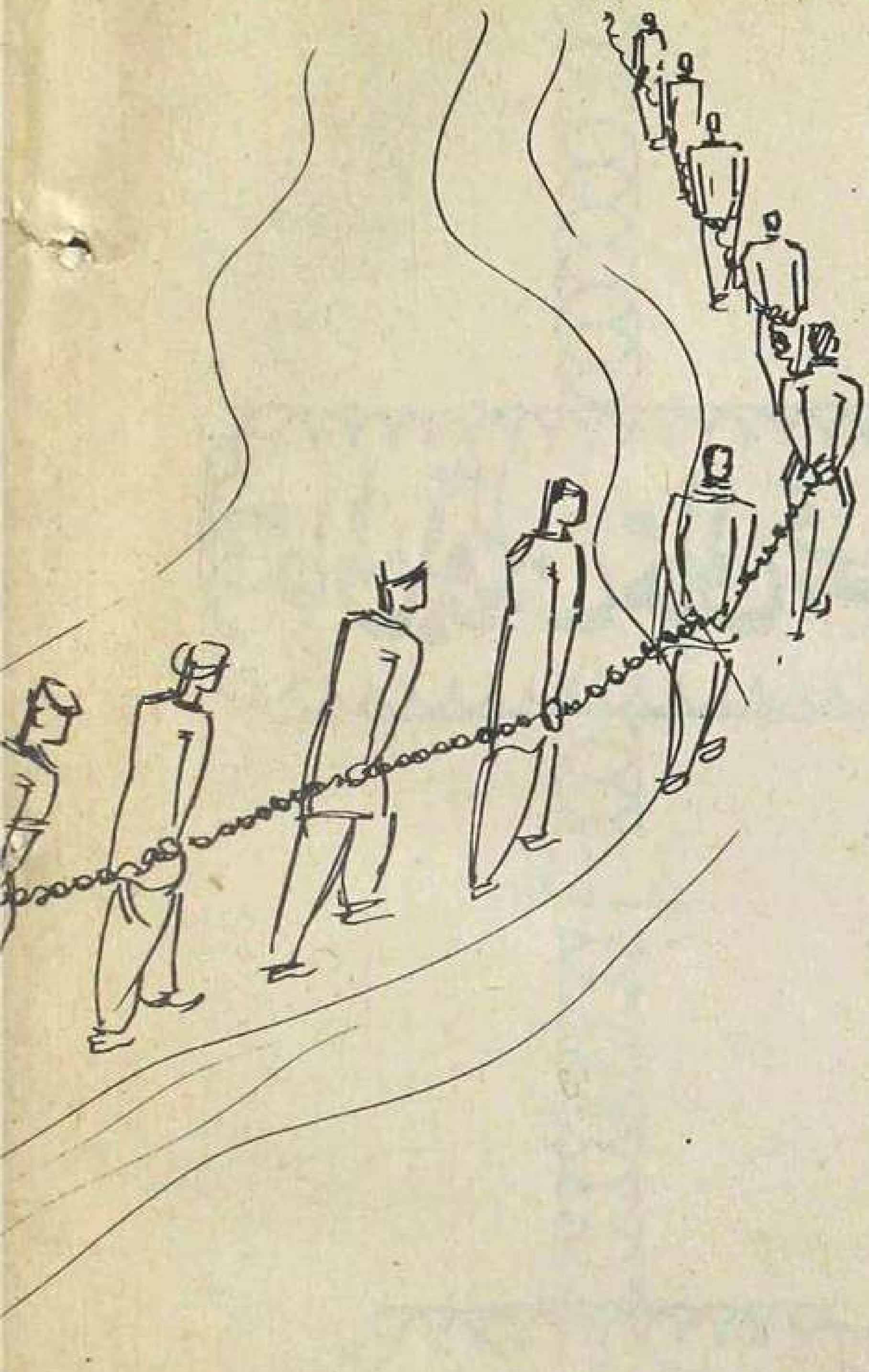

POCKET BOOK

مشورہ بک ڈپو

رام نگر۔ گاندھی نگر پوسٹ بکس 1639 دہلی ۵

خالی بوتلیں خالی ڈبے

سعادت حسن منٹو

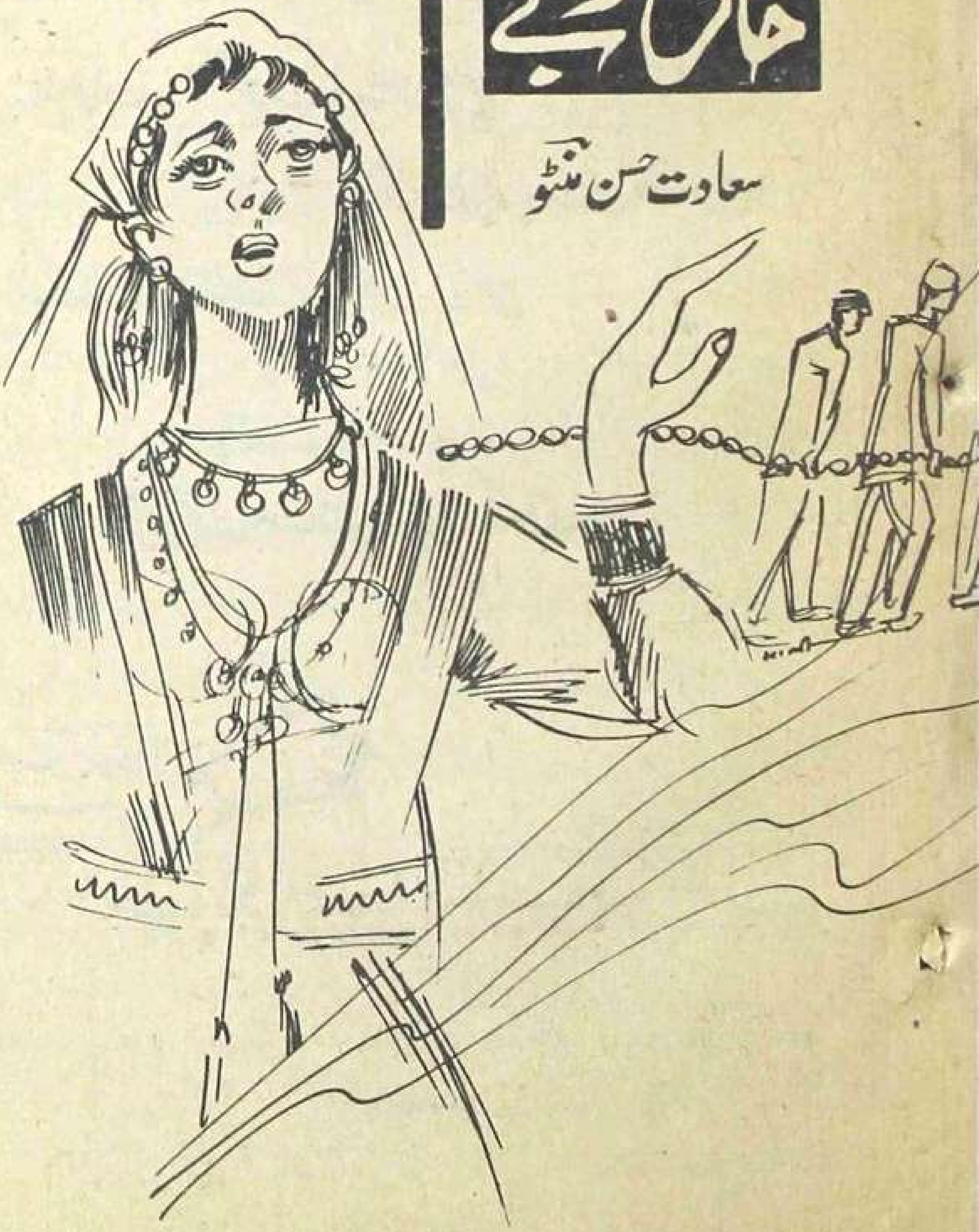

جملہ حقوق محفوظ ہیں

قیمت فی کتاب ایک روپیہ

ناشران :۔ مشورہ بک ڈپو

رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس ۱۶۳۹ دہلی ۶

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

پاکستان کے لئے سول ایجنٹ

یونین بک سٹال۔ بندر روڈ کراچی ۱

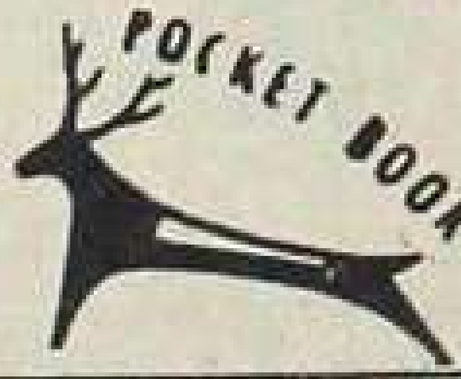

مشورہ بکس

اُردو کی اوّلین پاکٹ بکس

KHALI BOTLEN KHALI DA'BBE SAHADAT HASAN "MANTO"

STORIES

منٹو اور اُس کا فن

مادرِ گیتی ہر دور میں اپنی کوکھ سے چند ایسے انسانوں کو ڈھالتی ہے جو اپنے ساتھ شاندار قسم کی صلاحیتوں کا ایک خزانہ لیکر اِس دُنیا میں وارد ہوتے ہیں کبھی دُنیا انہیں ٹالسٹائی کہتی ہے کبھی ورڈزورتھ کبھی رابندرناتھ ٹیگور اور کبھی سعادت حسن منٹو! ۔ ایسے لوگ اس دُنیا میں آنیکے بعد منزل کی طرف بڑھتے رہتے ہیں مقصدِ حیات (جسکی تکمیل کا انحصار انکی فطری صلاحیتوں پر ہوتا ہے) کی تکمیل کرتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اِنکی شخصیتوں میں پنہاں جوہر اُجاگر ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے اور شمار کرتے وقت منٹو کو چھوڑ جانا سچائی اور حقیقت سے انحراف کرنا کہا جاسکتا ہے ۔ منٹو نے زندگی بھر اپنے فن کیساتھ انصاف کیا ہے۔ اس نے اپنے لئے زندگی کی نرم راہوں کو نہیں چُنا۔ اس نے "لیلیٰ مجنوں" ٹائپ کے روایتی قصّوں کو الفاظ کے تانے بانے میں اُلجھا کر گھسی پٹی ڈگر پر مضحکہ خیز انداز میں چلنا پسند نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی۔ راہ جو کھُردری تھی۔ خاردار تھی۔ وہ روایتی قسم کے ڈائیلاگ لکھ لکھ کر محبت کی سپاٹ سطح پر پھسلا نہیں۔ اُسے پھسل جانا پسند نہیں تھا۔ اٹک جانا پسند تھا۔ وہ ہر جگہ اٹک کر زندگی کی تلخیوں کا جائزہ لیکر چبھن محسوس کر کے آگے بڑھنا پسند کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اس نے ادب کو جو کچھ دیا اسکی پیشانی پر ہر ذی ہوش آدمی "معقول" کا لیبل چسپاں کرنا پڑیگا۔

میں دیکھتا ہوں سُنتا ہوں اور پڑھتا ہوں کہ بیشتر لوگ منٹو کے افسانوں کو فحش کہتے ہیں۔ طبیعت جھنجھلا کر ہی تو رہ جاتی ہے۔ ارے۔ حقیقت کی ایماندارانہ عکاسی معاشرے کے سڑتے گلے ہوئے پہلوؤں کی چیرہ دستی اور ہماری تہذیب اور تمدّن کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتے

والے ناسوروں کا پوسٹ مارٹم فحاشی ہے۔

میں منٹو سے کبھی نہیں مل سکا کیونکہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے منٹو اس دنیا کو چھوڑ چکا تھا۔ مگر... منٹو سے میں نے سینکڑوں مرتبہ اسکے فن کے ذریعہ ملاقات کی ہے۔۔ تب میں نے دیکھا ہے، منٹو کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ چپکی ہے۔ جو اس معاشرے کے تہذیب اور تمدن کیلئے ہے۔ جو نہ صرف طنز آمیز ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ تلخ بھی۔ پھر... میں نے دیکھا ہے۔ میں نے سُنا ہے۔ منٹو کہہ رہا ہے ـــ دیکھو۔ سیتا ساوتری اور رضیہ سلطانہ کے قصّے سنانے والو۔ دیکھو سیتا ساوتری اور رضیہ کے ہی اس دیش میں ایک گھاٹن صرف ایک روپیہ میں اپنا جسم بیچتی ہے۔ کسی بھی تاریک سڑک کی طرف نکل جاؤ۔ بوسوں کی "چٹاخ۔ چٹاخ" سن لو ساؤ۔ دیکھو ننگی زندگی کو۔ گرمیوں کی راتوں میں کسی بھی چھت پر ٹاٹوں کے برائے نام پردوں کو جھانکو۔ ان میں جھانکو۔ ادھر آؤ۔ دیکھو۔ اس الیکٹرک پول کے نیچے وہ لڑکی اپنے پرس میں سے ایک شیشہ اور ایک موچنا نکالکر۔ کیا کر رہی ہے بھلا۔ آ دیکھ ـــ دیش کی عظمتوں کا راگ الاپنے والو۔ بتاؤ یہ موچنے والی کون سے چور دروازے سے اس معاشرے میں آئی ہے۔ بوسوں کی چٹاخ چٹاخ کی آوازیں کیوں بلند ہوتی ہیں۔ یہ گھاٹن، اپنا جسم کیوں بیچ رہی ہے۔ بولو۔ بتاؤ۔ وہ کونسی طاقت ہے جو اس گھاٹن کو مجبور کر رہی ہے ایک روپیہ کے عوض اپنا جسم دیدینے کیلئے۔ بولو۔ سانپ کیوں سونگھ گیا ہے۔ مجھے فحش کہتے ہو۔ میرے فن کو فحش کہتے ہو.... جاؤ پہلے معاشرے کی اصلاح کرو۔ دیکھو.... دیکھو ـــ مضحکہ خیز انداز میں عظمتوں کا راگ الاپ کر سب ننگے ہوئے جا رہے ہیں۔ جاؤ ـــ ہٹ جاؤ۔

پھر.... میں نے دیکھا ہے منٹو کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ !

میرا سر جھک گیا ہے۔ میں ایک عظیم فن کار کو خراج عقیدت پیش کرتے جا رہا ہوں۔ !

جمیل انجم

۶۱۹۔ چوڑیوالان۔ جامع مسجد

دہلی ۶

لائسنس

ابّو کوچوان بڑا چھیل چھبیلا تھا۔ اس کا تانگہ گھوڑا بھی شہر میں نمبر ون تھا۔ کبھی معمولی سواری نہیں بٹھاتا تھا۔ اس کے لگے بندھے گاہک تھے جن سے اس کو روزانہ دس پندرہ روپے وصول ہو جاتے تھے جو ابّو کے لئے کافی تھے۔ دوسرے کوچوانوں کی طرح نشہ پانی کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیکن صاف ستھرے کپڑے پہننے اور ہر وقت بانکا بنے رہنے کا اسے بے حد شوق تھا۔

جب اس کا تانگہ کسی سڑک پر سے گھنگھرو بجاتا گزرتا تو لوگوں کی آنکھیں خود بخود اس کی طرف جاتیں۔ "وہ بانکا ابّو جا رہا ہے — دیکھو تو کس ٹھاٹھ سے بیٹھا ہے۔ ذرا پگڑی دیکھو کیسی ترچھی بندھی ہے۔"

ابّو لوگوں کی نگاہوں سے یہ باتیں سنتا تو اس کی گردن میں ایک بڑا بانکا خم پیدا ہو جاتا اور اس کے گھوڑے کی چال اور زیادہ پُرکشش ہو جاتی۔ ابّو کے ہاتھوں نے گھوڑے کی باگیں کچھ اس انداز سے پکڑی ہوتی تھیں جیسے ان کو اسے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ گھوڑا اشاروں کے بغیر

چلا جا رہا ہے۔ اس کو اپنے مالک کے حکم کی ضرورت نہیں۔ بعض وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابّو اور اس کا گھوڑا چنّی دونوں ایک ہیں، بلکہ سارا ٹانگہ ایک ہستی ہے۔ اور وہ ہستی ابّو کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔

وہ سواریاں جن کو ابّو قبول نہیں کرتا تھا دل ہی دل میں اس کو گالیاں دیتی تھیں۔ بعض بد دعا بھی دیتی تھیں۔ "خدا کرے اس کا گھمنڈ ٹوٹے۔ اس کا ٹانگہ گھوڑا کسی دریا میں جا گرے۔"

ابّو کے ہونٹوں پر جو ہلکی ہلکی مونچھوں کی چھاؤں میں رہتے تھے خود اعتمادی مسکراہٹ ناچتی رہتی تھی۔ اس کو دیکھ کر کئی کوچوان جل بھن جاتے تھے۔ ابّو کی دیکھا دیکھی چند کوچوانوں نے اِدھر اُدھر سے قرض لے کر تانگے لئے ان کو پیتل کے ساز و سامان سے سجایا۔ مگر پھر بھی ابّو جیسی شان پیدا نہ ہو سکی۔ اِن کو وہ گاہک نصیب نہ ہو سکے جو ابّو کے اور اس کے ٹانگے گھوڑے کے شیدا تھے۔

ایک دن دوپہر کو ابّو درخت کی چھاؤں میں ٹانگے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ایک آواز اس کے کانوں میں بھنبھنائی۔ ابّو نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک عورت ٹانگے کے بمپر کے پاس کھڑی تھی۔ ابّو نے اسے بمشکل ایک نظر دیکھا مگر اس کی تیکھی جوانی ایک دم اس کے دل میں کھب گئی۔ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی۔ سولہ سترہ برس کی۔ دُبلی پتلی لیکن مضبوط۔ رنگ سانولا مگر چمکیلا۔ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں۔ سیدھی مانگ ستواں ناک۔ اس کی پھننگ پر ایک چھوٹا سا چمکیلا تِل۔ لمبا کُرتا اور نیلا لاچا۔ سر

پر چدریا۔

لڑکی نے کنواری آواز میں ابّو سے پوچھا "ویراٹیشن کا کیا لگے۔؟"

ابّو کے ہونٹوں کی مُسکراہٹ شرارت اختیار کر گئی "کچھ نہیں"

لڑکی کے چہرے کی سنولاہٹ سرخی مائل ہو گئی "کیا لوگے ٹیشن کا۔؟"

ابّو نے اس کو اپنی نظروں میں سموتے ہوئے کہا "تجھ سے کیا لینا ہے بھاگ بھریے۔ چل آ بیٹھ تانگے میں"

لڑکی نے گھبرائے ہوئے ہاتھوں سے اپنے مضبوط سینے کو ڈھانکا حالانکہ وہ ڈھکا ہوا تھا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم۔؟"

ابّو مُسکرایا "چل آ، اب بیٹھ بھی جا۔ لیلیں گے جو تو دے دیگی"

لڑکی نے کچھ دیر سوچا، پھر پائدان پر پاؤں رکھ کر تانگے میں بیٹھ گئی "جلدی لے چل ٹیشن"

ابّو نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ "بڑی جلدی ہے تجھے سوہلیے"

"ہائے ہائے، تو تو ....." لڑکی کچھ اور کہتے کہتے رُک گئی۔

تانگہ چل پڑا۔ اور چلتا رہا۔ کئی سڑکیں گھوڑے کے سموں کے نیچے سے نکل گئیں۔ لڑکی سہمی بیٹھی تھی۔ ابّو کے ہونٹوں پر شرارت بھری مُسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو لڑکی نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا "ٹیشن نہیں آیا۔؟"

ابّو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا "آجائے گا۔ تیرا میرا ٹیشن ایکسا ہی ہے"

"کیا مطلب ۔ ؟"

ابّو نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا ۔

"الھڑ سے ۔ کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھتی ۔ تیرا میرا اسٹیشن ایک ہی ہے ۔ اسی وقت ایک ہو گیا تھا جب ابّو نے تیری طرف دیکھا تھا ۔ تیری جان کی قسم تیرا غلام جھوٹ نہیں بولتا ۔"

لڑکی نے سر پہ پلو ٹھیک کیا ۔ اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ ابّو کا مطلب سمجھ چکی ہے ۔ اس کے چہرے سے اس بات کا بھی پتہ چلتا تھا کہ اس نے ابّو کی بات کا بُرا نہیں مانا ۔ لیکن وہ اس کشمکش میں تھی کہ دونوں کا اسٹیشن ایک ہو یا نہ ہو ۔ ابّو بانکا سجیلا تو ہے لیکن کیا وفادار بھی ہے ۔ کیا وہ اپنا اسٹیشن بھی چھوڑ دے جہاں اس کی گاڑی پتہ نہیں کب کی جا چکی تھی ۔

ابّو کی آواز نے اس کو چونکا دیا ۔

"کیا سوچ رہی ہے بھاگ بھریئے ۔"

گھوڑا مست خرامی سے دُلکی چل رہا تھا ۔ ہوا خنک تھی ۔ سڑک کے دو رویہ اُگے ہوئے درخت بھاگ رہے تھے ۔ ان کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں ۔ گھنگھروؤں کی یک آہنگ جھنجھناہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی ۔ ابّو گردن موڑے لڑکی کے سانولے حُسن کو دل ہی دل میں چُوم رہا تھا ۔

کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کی باگیں جنگلے کی سلاخ کے ساتھ باندھ دیں اور اُچک کر پچھلی سیٹ پر لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا ۔ وہ خاموش رہی ۔ ابّو نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ۔

"دے دے اپنی باگیں میرے ہاتھ میں"

لڑکی نے صرف اتنا کہا "چھوڑ بھی دے"

لیکن وہ فوراً ہی اتو کے بازوؤں میں تھی۔ اس کے بعد اس نے مزاحمت نہ کی۔ اس کا دل البتہ زور زور سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جیسے خود کو چھڑا کر اُڑ جانا چاہتا ہو۔

اتو ہولے ہولے پیار بھرے لہجے میں اسے کہنے لگا۔

"یہ تانگا گھوڑا مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا۔ لیکن قسم گیارھویں والے پیر کی یہ بیچ دوں گا اور تیرے لئے سونے کے کڑے بنواؤں گا۔ آپ پھٹے پُرانے کپڑے پہنوں گا۔ لیکن تجھے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ قسم وحدہٗ لاشریک کی، زندگی میں یہ میرا پہلا پیار ہے۔ تم میری نہ بنیں تو میں تیرے سامنے گلا کاٹ لوں گا اپنا" پھر اُس نے لڑکی کو اپنے سے علیحدہ کر دیا "جانے کیا ہو گیا ہے مجھے ــــ چلو تمہیں ٹیشن چھوڑ آؤں"

لڑکی نے ہولے سے کہا۔

"نہیں ــــ اب تم مجھے ہاتھ لگا چکے ہو"

اتو کی گردن جھک گئی۔

"مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہوئی"

"نبھا لو گے اس غلطی کو۔؟"

لڑکی کے لہجے میں چیلنج تھا، جیسے کسی نے اتو سے کہا ہو "لے جاؤ گے اپنا ٹانگہ اس ٹانگے سے آگے نکال کے" ــــ اس کا جھکا ہوا سر اُٹھا ــــ

آنکھیں چمک اُٹھیں۔

"بھاگ بھریئے" یہ کہہ کر اُس نے اپنے مضبوط سینے پر ہاتھ رکھا۔

"ابّو اپنی جان دے دے گا"

لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"تو یہ ہے میرا ہاتھ"

ابّو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"قسم اپنی جوانی کی ابّو تیرا غلام ہے"

دوسرے روز ابّو اور اس لڑکی کا نکاح ہوگیا۔ وہ ضلع گجرات کی موچن تھی۔ نام اس کا عنایت یعنی نتی تھا۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آئی تھی۔ وہ اسٹیشن پر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ ابّو اور اس کی مُڈبھیڑ ہوگئی جو فوراً ہی محبت کی ساری منزلیں طے کر گئی۔

دونوں بہت خوش تھے۔ ابّو نے تانگہ گھوڑا بیچ کر نتی کے لئے سونے کے کڑے نہیں بنوائے تھے۔ لیکن اپنے جمع کئے ہوئے پیسوں سے اس کو سونے کی بالیاں خرید دی تھیں۔ کئی ریشمی کپڑے بھی بنوا دیئے تھے۔

لس لس کرتے ہوئے ریشمی لاچے میں حبیب نتی ابّو کے سامنے آتی تو اس کا دل ناچنے لگتا۔ "قسم پنج تن پاک کی دُنیا میں تجھ جیسا سُندر اور کوئی نہیں" اور یہ کہہ کر وہ اس کو اپنے سینے سے لگا لیتا "تو میرے دل کی رانی ہے"

دونوں جوانی کی مستیوں میں غرق تھے۔ گاتے تھے، ہنستے تھے، سیریں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی بلائیں لیتے تھے۔ ایک مہینہ اسی طرح گذر گیا کہ دفعتاً ایک روز پولیس نے ابّو کو گرفتار کر لیا۔ نیتی بھی پکڑی گئی۔ ابّو پر اغوا کا مقدمہ چلا۔ نیتی ثابت قدم رہی لیکن پھر بھی ابّو کو دو برس کی سزا ہو گئی۔ جب عدالت نے حکم سُنایا تو نیتی ابّو کے ساتھ لپٹ گئی۔ روتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا۔

"میں اپنے ماں باپ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی — گھر بیٹھ کر تیرا انتظار کروں گی۔"

ابّو نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

"جیتی رہ — ٹانگہ گھوڑا میں نے دینے کے سپرد کیا ہوا ہے۔ اس سے کرایہ وصول کرتی رہنا۔"

نیتی کے ماں باپ نے بہت زور لگایا۔ مگر وہ ان کے ساتھ نہ گئی۔ تھک ہار کر اُنھوں نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ نیتی اکیلی رہنے لگی۔ دینا اسے شام کو پانچ روپے دے جاتا تھا جو اس کے خرچ کے لیے کافی تھے اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں روزانہ پانچ روپے کے حساب سے جو کچھ جمع ہوا تھا وہ بھی اس کے پاس تھا۔

ہفتے میں ایک بار نیتی اور ابّو کی ملاقات جیل میں ہوتی تھی جو کہ ان دونوں کے لئے بہت ہی مختصر تھی۔ نیتی کے پاس جتنی جمع پونجی تھی وہ ابّو کو آسائشیں پہنچانے میں صرف ہو گئی۔ ایک مُلاقات میں ابّو نے

نیتی کے بچے کانوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"بالیاں کہاں گئیں نیتی۔؟"

نیتی مسکرا دی اور سنتری کی طرف دیکھ کر ابّو سے کہا۔

"گم ہو گئیں کہیں"

ابّو نے قدرے غصّے ہو کر کہا۔

"تم میرا اتنا خیال نہ رکھا کرو — جیسا بھی ہوں ٹھیک ہوں"

نیتی نے کچھ نہ کہا۔ وقت پورا ہو چکا تھا۔ مسکراتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ مگر گھر جا کر بہت روئی۔ گھنٹوں آنسو بہائے، کیونکہ ابّو کی صحت بہت گر رہی تھی۔ اس ملاقات میں تو وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ گرانڈیل ابّو اب گھل گھل کر آدھا ہو گیا تھا۔

نیتی سوچتی تھی کہ اس کو اس کا غم کھا رہا ہے۔ اس کی جدائی نے ابّو کی یہ حالت کر دی ہے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دق کا مریض ہے۔ اور یہ مرض اُسے ورثے میں ملا ہے۔ ابّو کا باپ ابّو سے کہیں زیادہ گرانڈیل تھا۔ لیکن دق نے اسے چند دنوں ہی میں قبر میں پہنچا دیا۔ ابّو کا بڑا بھائی کڑیل جوان تھا لیکن عین جوانی میں اس مرض نے اسے دبوچ لیا تھا۔ خود ابّو اس حقیقت سے غافل تھا چنانچہ جیل کے ہسپتال میں جبکہ وہ آخری سانس لے رہا تھا، اس نے افسوس بھرے لہجہ میں نیتی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہوتا کہ میں اتنی جلدی مر جاؤں گا تو قسم وحدہٗ لاشریک کی تجھے کبھی اپنی بیوی نہ بناتا — میں نے تیرے ساتھ بہت ظلم کیا — مجھے

معاف کر دے ۔ اور دیکھ میری ایک نشانی ہے ۔ میرا ٹانگہ گھوڑا ۔ اس کا خیال رکھنا ۔ اور جنّی بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنا ۔ ابّو نے تجھے پیار بھیجا ہے ۔"

ابّو مر گیا ۔ نیتی کا سب کچھ مر گیا ۔ مگر وہ حوصلے والی عورت تھی ۔ اس صدمے کو اس نے برداشت کر ہی لیا ۔ گھر میں تن تنہا پڑی رہتی تھی ۔ شام کو دینا آتا تھا اور اسے دم دلاسا دیتا تھا اور کہتا تھا ۔

"کچھ فکر نہ کرو بھابھی ۔ اللہ میاں کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی ۔ ابّو میرا بھائی تھا ۔ مجھ سے جو ہو سکتا ہے خدا کے حکم سے کروں گا ۔"

شروع شروع میں تو نیتی نہ سمجھی پر جب اس کے عدّت کے دن پورے ہوئے تو دینے نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اس سے شادی کرے یہ سُن کر نیتی کے جی میں آئی کہ وہ اس کو دھکا دے کر باہر نکال دے مگر اس نے صرف اتنا کہا ۔

"بھائی مجھے شادی نہیں کرنی ۔"

اس دن سے دینے کے رویّے میں فرق آ گیا ۔ پہلے شام کو ملا تا غہ پانچ روپے ادا کرتا تھا ۔ اب کبھی چار دینے لگا کبھی تین ۔ بہانہ یہ کہ بہت مندا ہے ۔ پھر دو دو تین تین دن غائب رہنے لگا ' بہانہ یہ کہ بیمار تھا یا ٹانگے کا کوئی کل پرزہ خراب ہو گیا تھا ۔ اس لئے جوڑ نہ سکا ۔ جب پانی سر سے نکل گیا تو نیتی نے دینے سے کہا "بھائی دینے اب تم تکلیف نہ کرو ۔ ٹانگہ

گھوڑا میرے حوالے کردو"

بڑی لیت ولعل کے بعد بالآخر دینے لے بادلِ ناخواستہ ٹانگا گھوڑا نیتی کی تحویل میں دے دیا۔ اس نے ماجھے کے سپرد کر دیا جو ابّو کا دوست تھا۔

اس نے بھی کچھ دنوں کے بعد شادی کی درخواست کی۔ نیتی نے انکار کیا تو اس کی آنکھیں بدل گئیں۔ ہمدردی وغیرہ سب ہوا ہوگئی۔ نیتی نے اس سے ٹانگا گھوڑا واپس لیا اور ایک انجانے کوچوان کے حوالے کر دیا۔ اس نے توحد ہی کر دی۔ ایک شام پیسے دینے آیا تو شراب میں دُھت تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی نیتی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ نیتی نے اس کو خوب سُنائیں اور کام سے ہٹا دیا۔

آٹھ دس روز ٹانگا گھوڑا بیکار طویلے میں پڑا رہا۔ گھاس دانے کا خرچ علیٰحدہ۔ طویلے کا کرایہ علیٰحدہ۔ نیتی عجیب اُلجھن میں گرفتار تھی۔ کوئی شادی کی درخواست کرتا تھا۔ کوئی اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ کوئی پیسے مار لیتا تھا۔ باہر نکلتی تھی تو لوگ بُری نگاہوں سے گھُورتے تھے۔ ایک رات اُس کا ہمسایہ دیوار پھاند کے آگیا اور دراز دستی کرنے لگا۔ نیتی سوچ سوچ کر پاگل ہوگئی کہ کیا کرے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا "کیوں نہ ٹانگا میں آپ ہی جوتوں۔ آپ ہی چلاؤں" ابّو کے ساتھ جب وہ سیر کو

جایا کرتی تھی تو ٹانگا خود ہی چلایا کرتی تھی۔ شہر کے راستوں سے بھی واقف تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچا "لوگ کیا کہیں گے؟" اس کے جواب میں اس کے دماغ نے کئی دلیلیں دیں۔ "کیا حرج ہے ۔۔ کیا حرج ہے ۔۔ کیا عورتیں محنت مزدوری نہیں کرتیں ۔۔ یہ کوئلے والیاں ۔۔ یہ دفتروں میں جانے والی عورتیں ۔۔ گھر میں بیٹھ کر کام کرنے والیاں تو ہزاروں ہوں گی ۔۔ کسی حیلے سے پیٹ پالنا ہی ہے"

نیتی نے کچھ دن سوچ بچار کیا۔ آخر میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ٹانگہ خود چلائے گی۔ اس کو خود پر پورا اعتماد تھا، چنانچہ اللہ کا نام لے کر وہ طویلے پہونچ گئی ۔۔

ٹانگہ جوتنے لگی تو سارے کوچوان ہکّا بکّا رہ گئے۔ بعض مذاق سمجھ کر خوب ہنسے۔ جو بزرگ تھے اُنھوں نے نیتی کو سمجھایا۔ کہ دیکھو ایسا نہ کرو۔ یہ مناسب نہیں مگر نیتی نہ مانی۔ ٹانگا ٹھیک ٹھاک کیا پیتل کا ساز و سامان اچھی طرح چمکایا۔ گھوڑے کو خوب پیار کیا۔ اور اتو سے دل ہی دل میں پیار کی باتیں کرتی طویلے سے باہر نکل گئی۔ کوچوان حیرت زدہ تھے، کیونکہ نیتی کے ہاتھ رواں تھے جیسے وہ ٹانگہ چلانے کے فن پر حاوی ہے۔

شہر میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا کہ ایک خوبصورت عورت ٹانگہ چلا رہی ہے۔ ہر جگہ اس بات کا چرچا تھا۔ لوگ سُنتے تھے تو اس وقت کا انتظار کرتے تھے جب وہ ان کی سڑک پر سے گزریگا۔

شروع شروع میں تو مرد سواریاں جھجکتی تھیں مگر یہ جھجک تھوڑی دیر میں دور ہوگئی۔ اور خوب آمدن ہونے لگی۔ ایک منٹ کے لئے بھی نیتی کا ٹانگہ بیکار نہ رہتا تھا۔ ادھر سواری اُتری اُدھر بیٹھی۔ آپس میں کبھی کبھی سواریوں کی لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ اس بات پر کہ نیتی کو پہلے کس نے بُلایا تھا۔

جب کام زیادہ ہو گیا تو نیتی نے تانگہ جوتنے کے اوقات مقرر کر دیئے صبح سات بجے سے بارہ بجے، دوپہر دو سے چھ بجے تک۔ یہ سلسلہ بڑا آرام دہ ثابت ہوا۔ چنتی بھی خوش تھا۔ مگر نیتی محسوس کر رہی تھی کہ اکثر لوگ صرف اس کی قربت حاصل کرنے کے لئے اس کے ٹانگے میں بیٹھتے۔ بے مطلب، بے مقصد اِدھر اُدھر پھرا تے تھے۔ آپس میں گندے گندے مذاق بھی کرتے تھے۔ صرف اس کو سُنانے کے لئے باتیں کرتے تھے۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ تو خود کو نہیں بیچتی۔ لیکن لوگ چُپکے چُپکے اسے خرید رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ شہر کے سارے کوچوان اس کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ان تمام احساسات کے باوجود وہ مضطرب نہیں تھی۔ اپنی خود اعتمادی کے باعث وہ پُرسکون تھی۔

ایک دن کمیٹی والوں نے نیتی کو بُلایا اور اس کا لائسنس ضبط کر لیا۔ وجہ یہ بتائی کہ عورت ٹانگہ نہیں چلا سکتی۔

نیتی نے پوچھا۔

"جناب عورت ٹانگہ کیوں نہیں چلا سکتی"۔

جواب ملا۔

"بس نہیں چلا سکتی۔ تمہارا لائسنس ضبط ہے"۔

نیتی نے کہا۔

"حضور، آپ گھوڑا ٹانگہ بھی ضبط کر لیں، پر مجھے یہ تو بتائیں کہ عورت کیوں ٹانگہ نہیں چلا سکتی، عورتیں چرخہ چلا کر اپنا پیٹ پال سکتی ہیں عورتیں ٹوکری ڈھو کر روٹی کما سکتی ہیں۔ عورتیں لینوں پر کوئلے چُن چُن کر اپنی روٹی پیدا کر سکتی ہیں۔۔۔ میں ٹانگہ کیوں نہیں چلا سکتی۔ مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں۔۔۔ ٹانگہ گھوڑا میرا خوندکا ہے۔ میں اسے کیوں نہیں چلا سکتی۔ میں اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟۔۔۔ حضور آپ رحم کریں۔ محنت مزدوری سے کیوں روکتے ہیں مجھے؟۔۔۔ میں کیا کروں، بتائیے نا مجھے"۔

افسر نے جواب دیا "جاؤ بازار میں جا کر بیٹھو۔۔۔ وہاں زیادہ کمائی ہے"۔

یہ سُن کر نیتی کے اندر جو اصل نیتی تھی جل کر راکھ ہو گئی۔۔۔ ہولے سے "اچھا جی" کہہ کر وہ چلی گئی۔ اونے پونے داموں ٹانگہ گھوڑا بیچا اور سیدھی ابو کی قبر پر گئی۔ ایک لحظے کے لئے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں جیسے بارش کے بعد چلچلاتی دھوپ نے زمین کی ساری نمی چوس لی تھی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ وا ہوئے

اور وہ قبر سے مخاطب ہوئی "ابّو ۔۔۔ تیری نیتی آج کمیٹی کے دفتر میں مر گئی"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی ۔ دوسرے دن عرضی دی ۔۔۔ اس کو اپنا جسم بیچنے کا لائسنس مل گیا ۔

کتاب کا خلاصہ

سردیوں میں انور چھتی پر پتنگ اُڑا رہا تھا۔ اس کا چھوٹا بھانجا اس کے ساتھ تھا۔ چونکہ انور کے والد کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور وہ دیر سے واپس آنے والے تھے اس لئے وہ پوری آزادی اور بڑی بے پروائی سے پتنگ بازی میں مشغول تھا۔ پیچ ڈھیل کا تھا۔ انور بڑے زوروں سے اپنی مانگ پائی پتنگ کو ڈور پلا رہا تھا۔ اس کے بھانجے نے جس کا چھوٹا سا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور جس کی آنکھیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں انور سے کہا "ماموں جان کھینچ کے پیٹا کاٹ لیجئے" مگر وہ دھڑا دھڑا ڈور پلاتا رہا۔

نیچے کھلے کوٹھے پر انور کی بہن سہیلیوں کے ساتھ دھوپ سینک رہی تھی۔ سب کشیدہ کاری میں مصروف تھیں۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ انور کی بہن شمیم انور سے دو برس بڑی تھی۔ کشیدہ کاری اور

سینے پرونے کے کام میں ماہر۔ اسی لئے گلی کی اکثر لڑکیاں اس کے پاس آتی تھیں اور گھنٹوں بیٹھی کام سیکھتی رہتی تھیں۔ ایک ہندو لڑکی جس کا نام بملا تھا بہت دُور سے آتی تھی۔ اس کا گھر قریباً دو میل پرے تھا لیکن وہ ہر روز بڑی باقاعدگی سے آتی اور بڑے انہماک سے کشیدہ کاری کے نئے نئے ڈیزائن سیکھا کرتی تھی۔

بملا کا باپ اسکول ماسٹر تھا۔ بملا ابھی چھوٹی بچی ہی تھی کہ اس کی ماں کا دیہانت ہوگیا۔ بملا کا باپ ہری چرن چاہتا تو بڑی آسانی سے دوسری شادی کر سکتا تھا مگر اس کو بملا کا خیال تھا' چنانچہ وہ رنڈوا ہی رہا اور بڑے پیار محبت سے اپنی بچی کو پال پوس کر بڑا کیا۔ اب بملا سولہ برس کی تھی۔ سانولے رنگ کی دُبلی پتلی لڑکی۔ خاموش خاموش بہت کم باتیں کرنے والی۔ بڑی شرمیلی۔ صبح دس بجے آتی۔ آپا شمیم کو پرنام کرتی اور اپنا تھیلا کھول کر کام میں مشغول ہو جاتی۔

انور اٹھارہ برس کا تھا۔ اس کو تمام لڑکیوں میں سے صرف سعیدہ سے ہلکی سی دلچسپی تھی۔ لیکن یہ ہلکی سی دلچسپی کوئی اور صورت اختیار نہیں کر سکی تھی اس لئے کہ اس کی بہن اس کو لڑکیوں میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ کبھی ایک لحظہ کے لئے ان کے پاس آ بیٹھتا تو آپا شمیم فوراً ہی اس کو حکم دیتیں "انور اُٹھو' تمہارا یہاں کوئی کام نہیں" اور انور کو اس حکم کی فوری تعمیل کرنی پڑتی۔

بملا البتہ کبھی کبھی انور کو بُلاتی تھی' ناول لینے کیلئے۔ اس نے شمیم سے کہا تھا۔

"گھر میں میرا جی نہیں لگتا۔ پتا جی باہر شطرنج کھیلنے چلے جاتے ہیں۔ میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ انور بھائی سے کہئے مجھے ناول دیدیا کریں پڑھنے کیلئے۔"

پہلے تو بملا شمیم کے ذریعہ سے ناول لیتی رہی پھر کچھ عرصے کے بعد اس نے براہ راست انور سے مانگنے شروع کر دیئے۔ انور کو بملا بڑی عجیب و غریب لڑکی لگتی تھی یعنی ایسی جو بڑے غور سے دیکھنے پر دکھائی دیتی تھی۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں تو وہ بالکل غائب ہو جاتی تھی پھٹک میں جب وہ انور سے نیا ناول مانگنے آتی تو اس کو اس کی آمد کا اس وقت پتہ چلتا جب وہ اس کے پاس آ کر اپنی دھیمی آواز میں کہتی "انور صاحب — یہ لیجئے اپنا ناول — شکریہ۔"

انور اس کی طرف دیکھتا۔ اس کے دماغ میں عجیب و غریب تشبیہہ پھدک اٹھتی۔ "یہ لڑکی تو ایسی ہے جیسے کسی کتاب کا خلاصہ۔"

بملا اور کوئی بات نہ کرتی۔ پرانا ناول واپس کر کے نیا ناول لیتی اور نمستے کر کے چلی جاتی۔ انور اسکے متعلق چند لمحات سوچتا' اس کے بعد وہ اس کے دماغ سے نکل جاتی لیکن انور نے ایک بات ضرور محسوس کی تھی کہ بملا نے ایک دو بار اس سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر کہتے کہتے رک گئی تھی۔ انور سوچتا "کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے؟" اس کا جواب اس کا دماغ یوں دیتا "کچھ بھی نہیں۔ مجھ سے وہ کیا کہنا چاہتی ہوگی بھلا۔؟"

انور چھٹی پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ پیچ ڈھیل کا تھا' خوب ڈور بلا رہا تھا۔ دفعتاً اسکی بہن شمیم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "انور۔ انور۔ ابا جی آ گئے۔"

انور کو اور کچھ نہ سوجھا۔ ہاتھ سے ڈور توڑی اور مٹی پر سے نیچے کود پڑا۔ وہ کاٹا
وہ کاٹا کا شور بلند ہوا۔ انور کا گھٹنا بڑے زوروں سے چھل گیا تھا۔ ایک اس کو
اس کا دکھ تھا اس پر اس ۔۔۔ کہ حریف کے فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔ لنگڑاتا
لنگڑاتا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ گھٹنے کو دیکھا تو اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ بملا
سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتارا، کنارے پر سے تھوڑا سا پھاڑا
اور پٹی بنا کر انور کے گھٹنے پر باندھ دیا۔ انور اس وقت اپنے پتنگ کے متعلق سوچ رہا
تھا۔ اس کو یقین تھا کہ میدان اس کے ہاتھ رہیگا لیکن اسکے باپ کی بے وقت آمد
نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اتنے بڑھے ہوئے پتنگ کا خاتمہ کر دے
حریفوں کے نعرے ابھی تک گونج رہے تھے۔ اس نے غصہ آمیز آواز میں اپنی
بہن سے کہا " ابا جی کو بھی اسی وقت آنا تھا "
شمیم مسکرائی " وہ کب آئے ہیں "
انور چلایا " کیا کہا ؟ "
شمیم ہنسی " میں نے تم سے مذاق کیا تھا "
انور برس پڑا " میرا بیڑا غرق کرا کے آپ ہنس رہی ہیں۔ اچھا مذاق ہے
ایک میرا اتنا بڑھا ہوا پتنگ غارت ہوا۔ لوگوں کے آوازے سنے۔ اور گھٹنا
الگ زخمی ہوا "
یہ کہہ کر انور نے اپنے گھٹنے کی طرف دیکھا۔ سفید ململ کی پٹی بندھی تھی۔ اب
اس کو یہ یاد آیا کہ یہ پٹی بملا نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کے اسی کے باندھی تھی۔ اس نے
شکر گذار آنکھوں سے بملا کو دیکھا اور اس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس کے زخم

گے درد کو محسوس کر رہی ہے۔

بملا شمیم سے مخاطب ہوئی " آپا آپ نے بہت ظلم کیا۔ زیادہ چوٹ آجاتی تو۔"
وہ کچھ اور کہتے کہتے رُک گئی اور کشیدہ کاڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

انور کی نگاہ بملا سے ہٹ کر سعیدہ پر پڑی۔ سفید پل اوور میں وہ اسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ انور اس سے مخاطب ہوا "سعیدہ تم ہی بتاؤ یہ مذاق اچھا تھا ——ہنسی میں پھنسی ہو جاتی تو؟"

شمیم نے اسے ڈانٹ دیا " جاؤ انور تمہارا یہاں کوئی کام نہیں "

انور نے ایک نگاہ سعیدہ پر ڈالی۔ بہت اچھا کہہ کر اُٹھا اور لنگڑاتا لنگڑاتا پھر ممٹی پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر پتنگ اُڑائے۔ غصّے میں کھینچ کے ہاتھ مار کر تقریباً ایک درجن پتنگ کاٹے اور نیچے اُتر آیا۔ گھٹنے میں درد تھا۔ بیٹھک میں صوفے پر لیٹ گیا اور اوپر کمبل ڈال لیا۔ تھوڑی دیر اپنی فتوحات کے متعلق سوچا اور سو گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اس کو آواز سُنائی دی جیسے کوئی اسے بلا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا، سامنے بملا کھڑی تھی۔ مرجھائی ہوئی۔ کچھ سمٹی ہوئی سی۔ انور نے لیٹے لیٹے پوچھا "کیا ہے بملا۔؟"

" جی میں آپ سے کچھ ——" بملا رُک گئی " جی میں آپ سے کوئی —— نئی کتاب —— کوئی نئی کتاب دیجئے "

انور نے کہا " میرے گھٹنے میں زوروں کا درد ہے —— وہ جو سامنے الماری ہے، اسے کھول کر، جو کتاب تمہیں پسند ہو لے لو "

بملا چند لمحات کھڑی رہی، پھر چونکی " جی۔ ؟"

انور نے اس کو غور سے دیکھا۔ اس ڈوپٹے کے پیچھے جس میں سے بملا نے پٹی پھاڑی تھی، بڑی بڑی قسم کی چھاتیاں دھڑک رہی تھیں۔ انور کو اس پر ترس آیا۔ اس کی شکل و صورت، اس کے خدوخال ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ اس کو دیکھ کر انور کے دل و دماغ میں ہمیشہ رحم کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ اس کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ یہ کہا "پٹی باندھنے کا شکریہ"

بملا نے کچھ کہے بغیر الماری کا رُخ کیا اور اسے کھول کر کتابیں دیکھنے لگی۔ انور کے دماغ میں وہ تشبیہہ پھر پھدکی "یہ کتاب نہیں، کتاب کا خلاصہ ہے۔ بہت ہی ردّی کاغذوں پر چھپا ہوا"

بملا نے ایک بار انور کو کنکھیوں سے دیکھا مگر جب اسے متوجہ پایا تو اس کی طرف بیٹھ کر لی۔ کچھ دیر کتابیں دیکھیں۔ ایک منتخب کی، الماری کو بند کیا، انور کے پاس آئی اور "میں یہ لے چلی ہوں" کہہ کر چلی گئی۔

انور نے بملا کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر اس کو سعیدہ کے سفید پُل اوور کا خیال آتا رہا۔ پُل اوور پہننے سے جسم کے خط کتنے واضح ہو جاتے ہیں۔ سعیدہ کا سینہ اور اس بملا کی مریل چھاتیاں۔ جیسے ان کا دودھ اگ کر کے صرف پانی رہنے دیا گیا ہے... سعیدہ کے گھنگھریالے بال..... کم بخت نے اپنے ماتھے کے زخم کے نشان کو چھپانے کا کیا ڈھنگ نکالا ہے۔ بل کھاتی ہوئی ایک لٹ چھوڑ دیتی ہے اس پر۔ اور بملا۔ جانے کیا تکلیف ہے اسے۔ آج بھی کچھ کہتے کہتے رُک گئی تھی۔ مگر مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ شاید اس کا انداز ہی کچھ اسی قسم کا ہو۔ ہمیشہ کتاب اسی طرح مانگتی ہے جیسے

کوئی مدد مانگ رہی ہے۔ کوئی سہارا ڈھونڈھ رہی ہے۔ سعیدہ ماشاءاللہ آج سفید پل اوور میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ یہ قیامت ڈھانا کیا بکواس ہے ۔ قیامت تو ہر چیز کا خاتمہ ہے اور سعیدہ تو ابھی میری زندگی میں شروع ہوئی ہے۔ بملا۔ بملا۔ بھئی میری سمجھ میں نہیں آئی یہ لڑکی۔ باپ تو اس کو بہت پیار کرتا ہے۔ اسی کی خاطر اس نے دوسری شادی نہ کی۔ شاید ان کو کوئی مالی تکلیف ہو۔ لیکن گھر تو خاصا اچھا تھا۔ ایک ہی پلنگ تھا لیکن بڑا شاندار۔ صوفہ سٹ بھی برا نہیں تھا اور جو کھانا میں نے کھایا تھا اس میں کوئی برائی نہیں تھی.... سعیدہ کا گھر تو بہت ہی امیرانہ ہے۔ بڑی رئیس کی لڑکی ہے۔ اس ریاست کی ایسی تیسی۔ یہی تو بڑی مصیبت ہے ورنہ.... لیکن چھوڑو جی۔ سعیدہ جوان ہے' کل کلاں بیاہ دی جائے گی۔ مجھے خدا معلوم ابھی کتنے برس لگیں گے پوری تعلیم حاصل کرنے میں' بی' اے۔ بی' اے کے بعد ولایت۔ ہیم۔ ؟ دیکھیں گے! لیکن سفید پل اوور خوب تھا۔!"

انور کے دماغ میں اسی قسم کے مخلوط خیالات آتے رہے' اسکے بعد وہ دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

دوسرے روز بملا نہ آئی مگر انور نے اس کی غیر حاضری کو کچھ زیادہ محسوس نہ کیا' بس صرف اتنا دیکھا کہ وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں نہیں ہے ۔ شاید ہو' لیکن اگلے روز جب بملا آئی تو لڑکیوں نے اس سے پوچھا۔

"بملا تم کل کیوں نہ آئیں"

بملا اور زیادہ مرجھائی ہوئی تھی' اور زیادہ مختصر ہو گئی تھی جیسے کسی

نے زندہ پھیر کر اس کو ہر طرف سے چھوٹا اور پتلا کر دیا ہے۔ اس کا سانولا رنگ عجیب قسم کی دردناک زردی اختیار کر گیا تھا۔ لڑکیوں کا سوال سُن کر اُس نے انور کی طرف دیکھا جو گلوں میں پانی دے رہا تھا اور تھیلا کھول کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کل پتاجی — کل پتاجی بیمار تھے۔"

شمیم نے افسوس ظاہر کیا اور پوچھا "کیا تکلیف تھی انہیں۔؟"

بلا نے انور کی طرف دیکھا۔ چونکہ وہ اس کو دیکھ رہا تھا اس لئے نگاہیں دوسری طرف کر لیں اور کہا "تکلیف — معلوم نہیں کیا تکلیف تھی۔" پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اپنی چیزیں نکالیں "میں تو نہیں سمجھتی۔"

انور نے لوٹا منڈیر پر رکھا اور بلا سے مخاطب ہوا "کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیا ہوتا۔"

بلا انور کو بڑی تیز نگاہوں سے دیکھا "ان کا روگ ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

انور کو ایسا محسوس ہوا کہ بلا نے اس سے یہ کہا ہے "ان کا روگ تم سمجھ سکتے ہو۔" وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سعیدہ کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ وہ بلا سے کہہ رہی تھی "خالو جان کے پاس جائیں وہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ یوں چٹکیوں میں سب کچھ بتا دیں گے۔"

سعیدہ نے چٹکی بجائی تھی مگر بجی نہیں تھی۔ انور نے اس سے کہا "سعیدہ تم سے چٹکی کبھی نہیں بجے گی۔ فضول کوشش نہ کیا کرو۔"

سعیدہ شرما گئی۔ آج اس کا پُل اوور سیاہ تھا۔ انور نے سوچا "کمبخت پر ہر رنگ کھلتا ہے — لیکن کتنے پُل اوور ہیں اس کے پاس؟ — ہر وقت کوئی نہ کوئی بُنتی ہی رہتی ہے۔ سوئیٹروں اور پُل اوروں کا خبط ہے — اس سے میری شادی ہو جائے تو مزے آجائیں۔ پُل اوور ہی پُل اوور۔ دوست یار خوب جلیں — لیکن یہ بملا کیوں آج راکھ کا ڈھیر سے لگتی ہے۔ — سعیدہ شرما گئی تھی۔ یہ شرمانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ چٹکی بجانا سیکھ لے مجھ سے — مجھ سے نہیں تو کسی اور سے۔ لیکن بہترین چٹکی بجانے والا ہوں"

یہ سب کچھ اُس نے ایک سیکنڈ کے عرصے میں سوچا۔ سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ انور نے اس سے کہا "دیکھئے، چٹکی یوں بجایا کرتے ہیں۔" اور اس نے بڑے زور سے چٹکی بجائی۔ اتفاقاً اس کی نگاہ بملا پر پڑی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی مردنی طاری تھی۔ انور کے دل میں ہمدردی کے جذبات اُبھر آئے "بملا تم پتاجی سے کہو کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لیں — ان کے سوا تمہارا اور کون ہے۔؟"

یہ سُن کر بملا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زور سے دونوں ہونٹ بھینچے اور انتہائی ضبط کے باوجود زار و قطار روتی، برساتی کی طرف دوڑ گئی۔ ساری لڑکیاں کام چھوڑ کر اس کی طرف بھاگیں۔ انور نے برساتی میں جانا مناسب نہ سمجھا۔ نیچے بیٹھک میں چلا گیا۔ بملا کے بارے میں اس نے سوچنے کی کوشش کی مگر اس کے دماغ نے اس کی رہبری نہ کی۔ وہ بملا کے دُکھ درد کا صحیح تجزیہ نہ کر سکا۔ وہ صرف اتنا سوچ سکا کہ اس کو صرف اس بات کا غم ہے کہ اس کی

ماں زندہ نہیں۔

شام کو انور نے اپنی بہن سے بملا کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا "معلوم نہیں کیا دُکھ ہے بیچاری کو۔ اپنے باپ کا بار بار ذکر کرتی تھی کہ ان کو جانے کیا روگ ہے اور بس!"

سعیدہ پاس کھڑی تھی۔ سیاہ پُل اوور پہنے۔ اس کی جیتی جاگتی چھاتیاں آبنوسی گولوں کی صورت میں اس کے سفید نتواہ کے ڈوپٹے کے پیچھے بڑا دلکش تضاد پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے سیاہ بٹوں پر ان کی چمک چھپانے کے لئے کسی مکڑی نے مہین سا جالا بُن دیا ہے۔ انور بملا کا دکھ بھول گیا اور سعیدہ سے باتیں کرنے لگا۔ سعیدہ نے اس سے کوئی دلچسپی نہ لی اور آپا شمیم کو سلام کر کے چلی گئی۔

انور بیٹھک میں کالج کا کام کرنے بیٹھا تو اسے بملا کا خیال آیا "کیسی لڑکی ہے؟۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے پٹی باندھی۔۔ اپنا دوپٹہ پھاڑ کر۔ آج میں نے کہا 'پتاجی کے سوا تمہارا کون ہے تو اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ اور جب میں گملوں میں پانی دے رہا تھا تو بملا کی اس بات سے کہ ان کا روگ ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا اس نے کیوں یہ محسوس کیا تھا کہ بملا نے اس کے بجائے اس سے یہ کہا ہے' ان کا روگ تم سمجھ سکتے ہو۔۔ لیکن میں کیسے سمجھ سکتا ہوں۔ کیا سمجھ سکتا ہوں۔۔ وہ مجھے ٹھیک طور پر سمجھاتی کیوں نہیں، یعنی اگر وہ کچھ سمجھانا ہی چاہتی ہے۔۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تھا تو اس کی نگاہوں

میں اتنی تیزی کیوں تھی ۔۔ اب خیال کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میری ذہانت و فراست پر لعنت بھیج رہی تھی ۔۔ لیکن کیوں ؟ ۔۔ ہٹاؤ جی ..... سعیدہ ۔۔ ہاں وہ سیاہ پُل اوور ۔۔ سُفید نتون کا ہوائی دوپٹہ ۔۔ اور ... لیکن مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے ۔۔ جانے کس کا مال ہے .... خیر کچھ بھی ہو ۔ خوبصورت لڑکی ہے ۔ مگر اس پر خوبصورتی ختم تو نہیں ہوگئی ۔"

اگلے روز بملا نہ آئی ۔ انور کے گھر میں سب متفکر تھے ۔ دُعائیں کرتے تھے کہ خدا اُس کے باپ کو اُس کے سر پر سلامت رکھے ۔ شمیم کو بملا بے حد پسند تھی اس لئے کہ وہ خاموشی پسند اور ذہین تھی ۔ باریک سے بات فوراً سمجھ جاتی تھی ، چنانچہ وہ سارا دن وقفوں کے بعد اس کو یاد کرتی رہی ۔ انور کی ماں نے تو انور سے کہا کہ وہ سائیکل پر جائے اور بملا کے باپ کی خیریت دریافت کر آئے ۔

انور گیا ۔۔ بملا ساگوان کے چوڑے پلنگ پر خود بھی لیٹی تھی ، سانس کا اُتار چڑھاؤ تیز تھا ۔ انور نے ہولے سے پکارا تو کوئی ردِ عمل نہ ہوا ۔ ذرا بُلند آواز میں کہا " بملا " تو وہ چونکی ۔ کروٹ بدل کر اس نے انور کو دیکھا ۔ انور نے نمستے کی ۔ بملا نے ہاتھ جوڑ کر اس کا جواب دیا ۔

انور نے دیکھا کہ بملا کی آنکھیں میلی تھیں جیسے وہ روتی رہی تھی اور اس نے اپنے آنسو خشک نہیں کئے تھے ۔

پلنگ پر سے اٹھ کر اس نے انور کو کرسی پیش کی اور خود فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گئی۔ انور نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"وہاں سب کو فکر تھی ــ پتا جی کہاں ہیں ــ ؟"

بملا کے مرجھائے ہوئے ہونٹ کھلے اور اس نے کھوکھلی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"پتا ...... !"

انور نے پوچھا "طبیعت کیسی ہے اُن کی ؟"

"اچھی ہے"

بملا کی آواز اس کی آواز نہیں تھی۔

"تم آج نہیں آئیں تو سب کو بڑی تشویش ہوئی۔ امی جان نے مجھ سے کہا، سائیکل پر جاؤ اور پتہ لے کر آؤ ـــــــــ لالہ جی کہاں ہیں ؟"

"شطرنج کھیلنے گئے ہیں"

"تم آج کیوں نہیں آئیں ــ ؟"

"میں ــ ؟" یہ کہہ کر بملا رک گئی۔ تھوڑے وقفے کے بعد بولی "میں اب نہیں آسکوں گی ـــ مجھے ـــ مجھے ایک کام مل گیا ہے"

انور نے پوچھا۔

"کیا کام ــ ؟"

بملا نے ایک آہ بھری۔

"کل ہی معلوم ہوا ہے ـــ جانے کیا ہے" یہ کہتے ہوئے وہ کانپی

"ٹھیک ہے، جو کچھ بھی ہے ٹھیک ہے" پھر وہ جیسے اپنے اندر ڈوب گئی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر انور نے اُکتا کر پوچھا۔

"میں ان سے کیا کہوں۔؟"

بملا چونکی "کیا۔؟"

انور نے اپنے الفاظ دُہرائے۔

"میں ان سے کیا کہوں۔؟"

"اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں — سب کو نمستے"

انور کرسی پر سے اُٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر بملا کو نمستے کی۔ بملا نے اس کا جواب دیا۔ مگر انور کھڑا رہا۔ بملا خلا میں دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد انور اس سے مخاطب ہوا۔

"بملا — مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ..... مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم نے مجھ سے کئی بار کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر کہہ نہ سکیں — میں پوچھ سکتا ہوں؟"

بملا کے ہونٹوں پر ایک زخم خوردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انور اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ بملا اُٹھی۔ کھڑکی کے ساتھ لگ کر اس نے نیچے بڑی بدرو کی طرف دیکھا اور انور سے کہا۔

"جو میں کہہ نہ سکی، تم سمجھ نہ سکے، اب کہنے اور سمجھنے سے بہت پرے چلا گیا ہے — تم جاؤ، میں سونا چاہتی ہوں۔"

انور چلا گیا — بملا پھر نہ آئی۔

قریباً دس مہینے بعد اخباروں میں یہ سنسنی پھیلانے والی خبر شائع ہوئی کہ بڑی سڑک کی بدرو میں ایک نوزائیدہ بچہ مرا ہوا پایا گیا۔ تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ بچہ لالہ ہری چرن اسکول ماسٹر کی لڑکی بملا کا تھا اور بچے کا باپ خود لالہ ہری چرن تھا —

سب پر سکتہ تھا۔

انور نے سوچا۔

؎ تو ساری کتاب کا خلاصہ یہ تھا۔

دو قومیں

مختار نے شاردا کو پہلی مرتبہ جھرنوں میں سے دیکھا۔ وہ اوپر کوٹھے پر کٹا ہوا پتنگ لینے گیا تو اسے جھرنوں میں سے ایک جھلک دکھائی دی۔ سامنے والے مکان کی بالائی منزل کی کھڑکی کھلی تھی۔ ایک لڑکی ڈونگا ہاتھ میں لئے نہا رہی تھی۔ مختار کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ لڑکی کہاں سے آگئی، کیونکہ سامنے والے مکان میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ جو تھیں بیاہی جا چکی تھیں۔ صرف روپ کور تھی اس کا پلپلا خاوند کالو مل تھا۔ ان کے تین لڑکے تھے اور بس۔

مختار نے پتنگ اٹھایا اور ٹھٹک کے رہ گیا۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کے ننگے بدن پر سنہرے روئیں تھے۔ ان میں پھنسی ہوئی پانی کی ننھی ننھی بوندنیاں چمک رہی تھیں۔ اس کا رنگ ہلکا سانولا تھا، سانولا بھی نہیں۔ تانبے کے رنگ جیسا۔ پانی کی ننھی ننھی بوندنیاں ایسی لگتی تھیں جیسے اس کا بدن پگھل کر قطرے قطرے بن کر گر رہا ہے۔

مختار نے جھرنے کے سوراخوں کے ساتھ اپنی آنکھیں جما دیں اور اس

لڑکی کو جو ڈونگا ہاتھ میں لئے نہا رہی تھی' دلچسپی اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی تھی۔ گیلے سینے پر پانی کے قطرے پھسل رہے تھے بڑے دلفریب تھے۔ اس کو دیکھ کر مختار کے دل و دماغ میں سفلی جذبات پیدا نہ ہوئے۔ ایک جوان' خوبصورت اور بالکل ننگی لڑکی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ مختار کے اندر شہوانی ہیجان برپا ہو جاتا' مگر وہ بڑے ٹھنڈے انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا، جیسے کسی مصور کی تصویر دیکھ رہا ہے۔

لڑکی کے نچلے ہونٹ کے اختتامی کونے پر بڑا سا تل تھا۔ بے حد متین' بے حد سنجیدہ' جیسے وہ اپنے وجود سے بے خبر ہے' لیکن دوسرے اس کے وجود سے آگاہ ہیں' صرف اس حد تک کہ اسے وہیں ہونا چاہیئے تھا جہاں کہ وہ تھا۔

بانہوں پر سنہرے روئیں پانی کی بوندوں کے ساتھ لپٹے ہوئے چمک رہے تھے۔ اس کے سر کے بال سنہرے نہیں' بھوسلے تھے جنہوں نے شاید سنہرے ہونے سے انکار کر دیا تھا جسم سڈول اور گدرایا ہوا تھا لیکن اس کو دیکھنے سے اشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مختار دیر تک جھرنے کے ساتھ آنکھیں جمائے رہا۔

لڑکی نے بدن پر صابن ملا۔ مختار تک اس کی خوشبو پہنچی۔ سلونے' تانبے جیسے رنگ والے بدن پر سفید سفید جھاگ بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ پھر جب یہ جھاگ پانی کے بہاؤ سے پھسلے تو مختار نے

محسوس کیا جیسے اس لڑکی نے اپنا کُنبلوں کا لباس بڑے اطمینان سے اُتار کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔

غسل سے فارغ ہو کر لڑکی نے تولئے سے اپنا بدن پونچھا۔ بڑے سکون اور اطمینان سے آہستہ آہستہ کپڑے پہنے۔ کھڑکی کے ڈنڈے پر دونوں ہاتھ رکھے اور سامنے دیکھا۔ ایک دم اس کی آنکھیں شرماہٹ کی جھیلوں میں غرق ہو گئیں۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔

مختار بے اختیار ہنس پڑا۔

لڑکی نے فوراً کھڑکی کے پٹ کھولے اور بڑے غصّے میں جھرنے کی طرف دیکھا۔ مختار نے کہا۔

"میں قصوروار بالکل نہیں۔ آپ کیوں کھڑکی کھول کر نہا رہی تھیں"

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ غیض آلود نگاہوں سے جھرنے کو دیکھا اور کھڑکی بند کر لی۔

چوتھے دن روپ کور آئی۔ اس کے ساتھ یہی لڑکی تھی۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں سلائی اور کروشیے کے کام کی ماہر تھیں، گلی کی اکثر لڑکیاں ان سے یہ کام سیکھنے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ روپ کور بھی اس لڑکی کو اسی غرض سے لائی تھی۔ کیونکہ اس کو کروشیے کے کام کا بہت شوق تھا۔ مختار اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو اس نے روپ کور کو پرنام کیا۔ لڑکی پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ سمٹ سی گئی۔ مختار مسکرا کر

وہاں سے چلا گیا۔

لڑکی روزانہ آنے لگی ۔ مختار کو دیکھتی تو سمٹ جاتی ۔ آہستہ آہستہ اس کا یہ ردعمل دور ہوا ۔ اور اس کے دماغ سے یہ خیال کسی قدر محو ہوا کہ مختار نے اسے نہاتے دیکھا تھا۔

مختار کو معلوم ہوا کہ اس کا نام شاردا ہے روپ کور کے چچا کی لڑکی ہے۔ یتیم ہے۔ چیچو کی ملیاں میں ایک غریب رشتہ دار کے ساتھ رہتی تھی۔ روپ کور نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ انٹرنس پاس ہے۔ بڑی ذہین ہے، کیونکہ اس نے کروشیئے کا مشکل کام یوں چٹکیوں میں سیکھ لیا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ اس دوران میں مختار نے محسوس کیا کہ وہ شاردا کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہوا جب مختار نے اس کو پہلی بار جھرنے میں سے دیکھا تھا تو اس وقت اس کے سامنے ایک نظارہ تھا۔ بڑا فرحت ناک نظارہ۔ لیکن اب شاردا آہستہ آہستہ اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ مختار نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ یہ محبت کا معاملہ بالکل غلط ہے، اس لئے کہ شاردا ہندو ہے۔ مسلمان کیسے ایک ہندو لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ مختار نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا۔ لیکن وہ اپنے محبت کے جذبے کو مٹا نہ سکا۔

شاردا اب اس سے باتیں کرنے لگی تھی مگر کھل کے نہیں۔ اس کے دماغ میں مختار کو دیکھتے ہی یہ احساس بیدار ہو جاتا تھا کہ وہ ننگی نہا رہی

تھی اور مختار جھرنے میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ایک روز گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں کسی عزیز کے چالیسویں پر گئی ہوئی تھیں۔ شاردا حسبِ معمول اپنا تھیلا اُٹھائے صبح دس بجے آئی۔ مختار صحن میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ شاردا نے اس سے پوچھا۔

"بہن جی کہاں ہیں۔؟"

مختار کے ہاتھ کانپنے لگے "وہ۔ وہ کہیں باہر گئی ہے"

شاردا نے پوچھا "ماتا جی۔؟"

مختار اُٹھ کر بیٹھ گیا "وہ۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی گئی ہیں"

"اچھا!" یہ کہہ کر شاردا نے کسی قدر گھبرائی ہوئی آنکھوں سے مختار کو دیکھا اور نمستے کر کے چلنے لگی۔

مختار نے اس کو روکا "ٹھیرو شاردا۔!"

شاردا کو جیسے بجلی کے کرنٹ نے چھو لیا۔ چونک کر رُک گئی۔

"جی۔؟"

مختار چارپائی پر سے اُٹھا "بیٹھ جاؤ۔ وہ لوگ ابھی آ جائیں گے!"

"جی نہیں۔ میں جاتی ہوں" یہ کہہ کر بھی شاردا کھڑی رہی۔

مختار نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ آگے بڑھا۔ اس کی ایک کلائی پکڑی اور کھینچ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مختار اور شاردا دونوں کو ایک لحظے کے لئے بالکل پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔

بعد دونوں لرزنے لگے۔ مختار نے صرف اتنا کہا: "مجھے معاف کر دینا!"
شاردا خاموش کھڑی رہی۔ اس کا تانبے جیسا رنگ سُرخی مائل ہو گیا۔ ہونٹوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی جیسے وہ چھیڑے جانے پر شکایت کر رہے ہیں۔ مختار اپنی حرکت اور اس کے نتائج بھول گیا۔ اس نے ایک بار پھر شاردا کو اپنی طرف کھینچا اور سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ شاردا نے مزاحمت نہ کی۔ وہ صرف مجسمۂ حیرت بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک سوال بن گئی تھی۔ ایک ایسا سوال جو اپنے آپ سے کیا گیا ہو۔ وہ شاید خود سے پوچھ رہی تھی یہ کیا ہوا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ — کیا اسے ہونا چاہئے تھا۔ کیا ایسا کسی اور سے بھی ہوا ہے۔؟

مختار نے اسے چارپائی پر بٹھا لیا اور پوچھا "تم بولتی کیوں نہیں ہو شاردا۔؟"
شاردا کے دوپٹے کے پیچھے اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مختار کو اس کا یہ سکوت بہت پریشان کن محسوس ہوا۔ "بولو شاردا۔ اگر تمہیں میری یہ حرکت بُری لگی ہے تو کہہ دو۔ خدا کی قسم میں معافی مانگ لوں گا۔ تمہاری طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔ میں نے کبھی ایسی جرأت نہ کی ہوتی لیکن جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ دراصل — دراصل مجھے تم سے محبت ہے۔"

شاردا کے ہونٹ ہلے جیسے اُنھوں نے لفظِ "محبت" ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختار نے بڑی گرمجوشی سے کہنا شروع کیا "مجھے معلوم نہیں تم محبت کا مطلب سمجھتی ہو کہ نہیں — میں خود اس کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں رکھتا، صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہاری ساری ہستی کو اپنی

اِس مُٹھی میں لے لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں اپنی ساری زندگی تمہارے حوالے کر دوں گا۔ شاردا تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ ؟"

شاردا کی آنکھیں خواب گوں ہو گئیں۔ مختار نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ "میں نے اس روز جھرنے میں سے تمہیں دیکھا۔ نہیں۔ تم مجھے دکھائی دیں۔ وہ ایک ایسا نظارہ تھا جو میں تا قیامت نہیں بھول سکتا۔ تم شرماتی کیوں ہو۔ میری نگاہوں نے تمہاری خوبصورتی چُرائی تو نہیں۔ میری آنکھوں میں صرف اس نظارے کی تصویر ہے۔ تم اسے زندہ کر دو تو میں تمہارے پاؤں چوم لوں گا۔" یہ کہہ کر مختار نے شاردا کا ایک پاؤں چُوم لیا۔

وہ کانپ گئی۔ چارپائی پر سے ایک دم اُٹھ کر اُس نے لرزاں آواز میں کہا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟۔ ہمارے دھرم میں ——"

مختار خوشی سے اُچھل پڑا۔ "دھرم ورم کو چھوڑ دو۔ پریم کے دھرم میں سب ٹھیک ہے۔" یہ کہکر اُس نے شاردا کو چومنا چاہا۔ مگر وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹی اور بڑے شرمیلے انداز میں مُسکراتی بھاگ گئی۔ مختار نے چاہا کہ وہ اُڑ کر ممٹی پر پہنچ جائے۔ وہاں سے نیچے صحن میں کود دے اور ناچنا شروع کر دے۔

مختار کی والدہ اور بہن آ گئیں تو شاردا آئی۔ مختار کو دیکھ کر اس نے فوراً نگاہیں نیچی کر لیں۔ مختار وہاں سے کھسک گیا کہ راز افشا نہ ہو۔

دوسرے روز اوپر کوٹھے پر چڑھا۔ جھرنے میں سے جھانکا تو دیکھا کہ شاردا کھڑکی کے پاس کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ مختار نے اس

کو آواز دی۔ "شاردا!"

شاردا چونکی۔ کنگھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گلی میں جا گری۔ مختار ہنسا۔ شاردا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مختار نے اس سے کہا: "کتنی ڈرپوک ہو تم۔ ہولے سے آواز دی اور تمہاری کنگھی چھوٹ گئی۔"

شاردا نے کہا: "اب لا کے دیجئے نئی کنگھی مجھے۔ یہ تو موری میں جا گری ہے۔"

مختار نے جواب دیا: "ابھی لاؤں۔"

شاردا نے فوراً کہا: "نہیں نہیں۔ میں نے تو مذاق کیا ہے۔"

"میں نے بھی مذاق کیا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر میں کنگھی لینے جاتا؟ — کبھی نہیں —!"

شاردا مسکرائی: "میں بال کیسے بناؤں۔"

مختار نے جھرنے کے سوراخوں میں اپنی انگلیاں ڈالیں: "یہ میری انگلیاں لے لو!"

شاردا ہنسی۔ مختار کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری عمر اس ہنسی کی چھاؤں میں گزار دے: "شاردا، خدا کی قسم، تم ہنسی ہو، میرا رواں رواں شادماں ہو گیا ہے۔ تم کیوں اتنی پیاری ہو؟ — کیا دنیا میں کوئی اور لڑکی بھی تم جتنی پیاری ہوگی — یہ کم بخت جھرنے — یہ مٹی کے ذلیل پردے۔ جی چاہتا ہے ان کو توڑ پھوڑ دوں۔"

شاردا پھر ہنسی۔ مختار نے کہا: "یہ ہنسی کوئی اور نہ دیکھے، کوئی اور نہ

سُنے۔ شاردا صرف میرے سامنے ہنسنا۔ اور اگر کبھی ہنسنا ہو تو مجھے بُلا لیا کرو۔ میں اس کے اردگرد اپنے ہونٹوں کی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔"

شاردا نے کہا "آپ باتیں بڑی اچھی کرتے ہیں۔"

"تو مجھے انعام دو۔ محبت کی ایک ہلکی سی نگاہ ان جھرنوں سے میری طرف پھینک دو۔ میں اسے اپنی پلکوں سے اُٹھا کر اپنی آنکھوں میں چھپا لوں گا۔" مختار نے شاردا کے عقب میں دور ایک سایہ سا دیکھا اور فوراً جھرنے سے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو کھڑکی خالی تھی۔ شاردا جا چکی تھی۔

آہستہ آہستہ مختار اور شاردا دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ تنہائی کا موقعہ ملتا تو دیر تک محبت کی باتیں کرتے رہتے۔ ایک دن روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالو مل کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مختار گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کو ایک کنکر لگا۔ اس نے اوپر دیکھا شاردا تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بُلا لیا۔

مختار اس کے پاس پہونچ گیا۔ پورا تخلیہ تھا خوب کُھل کُھل کے باتیں ہوئیں۔

مختار نے اس سے کہا "اس روز مجھ سے گستاخی ہوئی تھی اور میں نے معافی مانگ لی تھی۔ آج پھر گستاخی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ لیکن معافی نہیں مانگوں گا۔" اور اپنے ہونٹ شاردا کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

شاردا نے شرمیلی شرارت سے کہا "اب معافی مانگئے۔"

"جی نہیں۔ اب یہ ہونٹ آپ کے نہیں۔ میرے ہیں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔؟"

شاردا نے نگاہیں نیچی کر کے کہا "یہ ہونٹ کیا۔ میں ہی آپ کی ہوں"

مختار ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "شاردا دیکھو۔ ہم اس وقت ایک آتش فشاں پہاڑ پر کھڑے ہیں۔ تم سوچ لو سمجھ لو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے سوا میری زندگی میں اور کوئی عورت نہیں آئے گی ۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ زندگی بھر میں تمہارا رہوں گا۔ میری محبت ثابت قدم رہیگی ۔ کیا تم بھی اس کا عہد کرتی ہو۔ ؟"

شاردا نے اپنی نگاہیں اُٹھا کر مختار کی طرف دیکھا۔ "میرا پریم سچا ہے۔"

مختار نے اُس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور کہا۔ "زندہ رہو ۔ صرف میرے لئے" میری محبت کے لئے وقف رہو۔ خدا کی قسم شاردا اگر تمہارا التفات مجھے نہ ملتا تو میں یقیناً خودکشی کر لیتا ۔ تم میری آغوش میں ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دُنیا کی خوشیوں سے میری جھولی بھری ہوئی ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔"

شاردا نے اپنا سر مختار کے کندھے پر گرا دیا۔ "آپ باتیں کرنا جانتے ہیں ۔ مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں کہی جاتی۔"

دیر تک دونوں ایک دوسرے میں مدغم رہے ۔ جب مختار وہاں سے گیا تو اس کی روح ایک نئی اور سہانی لذت سے معمور تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا دوسرے دن کلکتے چلا گیا جہاں اس کا باپ کاروبار کرتا تھا۔ آٹھ دن کے بعد واپس آیا۔ شاردا حسبِ معمول کروشیے کا کام سیکھنے مقررہ وقت پر آئی ۔ اس کی نگاہوں نے اس سے کئی باتیں کیں ۔ کہاں غائب رہے اتنے

دن ؟ — مجھ سے کچھ نہ کہا اور کلکتے چلے گئے ؟ — محبت کے بڑے دعوے کرتے تھے ؟ — میں نہیں بولوں گی تم سے — میری طرف کیا دیکھتے ہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔ مجھ سے ۔ ؟

مختار بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تنہائی نہیں تھی ۔ وہ کافی طویل گفتگو اس سے کرنا چاہتا تھا ۔ دو دن گزر گئے، موقعہ نہ ملا ۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں گونگی باتیں ہوتی رہیں ۔

آخر تیسرے روز شاردا نے اُسے بُلایا ۔ مختار بہت خوش ہوا ۔ روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالو مل گھر میں نہیں تھے ۔

شاردا سیڑھیوں میں ملی ۔ مختار نے وہیں اُس کو اپنے سینے کے ساتھ لگانا چاہا ۔ وہ تڑپ کر اوپر چلی گئی ۔ ناراض تھی ۔

مختار نے اس سے کہا ۔

"دیکھ میری جان، میرے پاس بیٹھو، میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں ایسی باتیں جن کا ہمارا زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے ۔"

شاردا اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی "تم بات ٹالو نہیں ۔ بتاؤ مجھے بتائے بغیر کلکتے کیوں گئے ۔ سچ میں بہت روئی ۔"

مختار نے بڑھ کر اس کی آنکھیں چومیں ۔

"اُس روز میں جب سے گیا تو ساری رات سوچتا رہا ۔ جو کچھ اُس روز ہوا اُس کے بعد یہ سوچ بچار لازمی تھی ۔ ہماری حیثیت میاں بیوی کی تھی ۔ میں نے غلطی کی ۔ تم نے کچھ نہ سوچا ۔ ہم نے ایک ہی جست میں

کئی منزلیں طے کرلیں اور یہ غور ہی نہ کیا کہ ہمیں جانا کس طرف ہے۔ سمجھ رہی ہو نا شاردا"
شاردا نے آنکھیں جھکا لیں۔

"جی ہاں"

"میں کلکتے اس لئے گیا تھا کہ اباجی سے مشورہ کروں۔ تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے ان کو راضی کرلیا ہے" مختار کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ شاردا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا "میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ میں اب تم سے شادی کرسکتا ہوں"
شاردا نے ہولے سے کہا۔

"شادی۔ ؟"

"ہاں شادی"

شاردا نے پوچھا "کیسے ہوسکتی ہے ہماری شادی۔ ؟"

مختار مسکرایا "اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ تم مسلمان ہو جانا!"

شاردا ایک دم چونکی۔

"مسلمان۔ ؟"

مختار نے بڑے اطمینان سے کہا "ہاں ہاں۔ اس کے علاوہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گھر والے بڑا ہنگامہ مچائیں گے لیکن میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے غائب ہو جائیں گے سیدھے کلکتے چلیں گے۔ باقی کام اباجی کے سپرد ہے۔ جس روز وہاں پہنچیں گے

اسی روز مولوی بُلا کر تمہیں مسلمان بنا دیں گے۔ شادی بھی اسی وقت ہو جائیگی۔"
مختار رداکے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیئے۔ مختار نے اس کی طرف دیکھا
"خاموش کیوں ہو گئیں۔؟"
شاردا نہ بولی۔ مختار کو بڑی اُلجھن ہوئی۔
"بتاؤ شاردا کیا بات ہے۔؟"
شاردا نے بہ مشکل اتنا کہا "تم ہندو ہو جاؤ"
"میں ہندو ہو جاؤں؟" مختار کے لہجہ میں حیرت تھی۔ وہ ہنسا "میں ہندو کیسے ہو سکتا ہوں۔؟"
"میں کیسے مسلمان ہو سکتی ہوں۔؟" شاردا کی آواز مدھم تھی۔
"تم کیوں مسلمان نہیں ہو سکتیں۔ میرا مطلب ہے کہ۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس کے علاوہ اسلام سب سے اچھا مذہب ہے۔ ہندو مذہب بھی کوئی مذہب ہے۔ گائے کا پیشاب پیتے ہیں۔ بُت پوجتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ٹھیک ہے اپنی جگہ یہ مذہب بھی۔ مگر اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" مختار کے خیالات پریشان تھے۔
"تم مسلمان ہو جاؤ گی تو بس۔ میرا مطلب ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
شاردا کے چہرے کا تانبے جیسا زرد رنگ زرد پڑ گیا "آپ ہندو نہیں ہونگے؟"
مختار ہنسا "پاگل ہو تم۔؟"
شاردا کا رنگ اور زرد پڑ گیا "آپ جائیے۔ وہ لوگ آنے والے ہیں"
یہ کہہ کر وہ پلنگ پر سے اُٹھی۔
مختار متحیر ہو گیا "لیکن شاردا...."

"نہیں نہیں جائیے آپا - جلدی جائیے ۔ وہ آجائیں گے" شاردا کے لہجہ میں بے اعتنائی کی سردی تھی۔

مختار نے اپنے خشک حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکالے "ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں شاردا تم ناراض کیوں ہوگئیں۔؟"

"جاؤ۔ چلے جاؤ۔ ہمارا ہندو مذہب بہت برا ہے۔ تم مسلمان بہت اچھے ہو" شاردا کے لہجے میں نفرت تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

مختار اپنا اسلام سینے میں دبائے وہاں سے چلا گیا۔

مجید کا ماضی

مجید کی ماہانہ آمدن ڈھائی ہزار روپے تھی۔ موٹر تھی۔ ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ بیوی تھی۔ اس کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے میل جول تھا۔ مگر جب کبھی وہ وسکی کے دو چار پیگ پی لیتا تو اسے اپنا ماضی یاد آجاتا۔ وہ وہ سوچتا کہ اب وہ اتنا خوش نہیں جتنا کہ پندرہ برس پہلے تھا۔ جب اسکے پاس رہنے کو کوٹھی تھی، نہ سواری کے لئے موٹر بیوی تھی نہ کسی عورت سے اس کی شناسائی تھی۔

ڈھائی ہزار روپے تو ایک اچھی خاصی رقم ہے۔ ان دنوں اس کی آمدن صرف ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ ساٹھ روپے جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا اس کی زندگی افتاں وخیزاں حالات کے ہوتے ہوئے بھی ہموار تھی۔

اب اسے بے شمار تفکرات تھے۔ کوٹھی کے۔ بیوی کے۔ بچوں کے۔ ان عورتوں کے جن سے ان کا میل جول تھا۔ انکم ٹیکس کا جھنجٹ الگ تھا۔ سیلز

شکیس کا جھگڑا جُدا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی اُلجھنیں تھیں جن سے مجید کو کبھی نجات ہی نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس زمانہ کو اکثر یاد کرتا تھا جب اس کی زندگی ایسے تفکرات اور ایسی اُلجھنوں سے آزاد تھی۔ وہ ایک بڑی غریبی کی لیکن بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتا تھا۔

انکم ٹیکس زیادہ لگ گیا ہے۔ ماہروں سے مشورہ کرو۔ آفیسروں سے ملو ان کو رشوت دو۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا چکاؤ۔ بلیک مارکیٹ کرو۔ یہاں سے جو کماؤ اس کو وائٹ کرو۔ جھوٹی رسیدیں بناؤ۔ مقدموں کی تاریخیں بھگتو۔ بیوی کی فرمائشیں پوری کرو۔ بچّوں کی نگہداشت کرو۔ یوں تو مجید کام بڑی مستعدی سے کرتا تھا اور وہ اپنی اس نئی ہنگامہ خیز زندگی میں رچ بس گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ناخوش تھا۔ یہ ناخوشی اسے کاروباری اوقات میں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کا احساس اس کو صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ فرصت کے اوقات میں آرام سے بیٹھ کر وسکی کے تین چار پیگ پیتا تھا۔ اس وقت بیتا ہوا زمانہ اس کے دل و دماغ میں ایک دم انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہو جاتا اور وہ بڑا سکون محسوس کرتا۔ لیکن جب اس بیتے ہوئے زمانے کی تصویر اس کے دل و دماغ میں محو ہو جاتی تو وہ بہت مضطرب ہو جاتا، پر یہ اضطراب دیرپا نہیں ہوتا تھا کیونکہ مجید فوراً ہی اپنی کاروباری اُلجھنوں میں گرفتار ہو جاتا تھا۔

مجید نے جو کچھ بنایا تھا، اپنی محنت و مشقّت سے بنایا تھا۔ کوٹھی، اس کا ساز و سامان، موٹر، غرضکہ ہر چیز اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی تھی۔

اس کو اس بات کا بہت مان تھا کہ آسائش کے جتنے سامان ہیں، سب اس نے خود بنائے ہیں۔ اس نے کسی سے مدد نہیں لی، لیکن تفکّرات اب زیادہ ہو گئے تھے۔

وہ جو دس پندرہ عورتیں تھیں اس کے لئے وبالِ جان بن گئی تھیں۔ ایک سے ملو تو دوسری ناراض ہو جاتی تھیں۔ ٹیلی فون پہ ٹیلی فون آ رہے ہیں۔ بیوی کا ڈر الگ، کاروبار کی فکر جدا۔ عجب جھنجٹ تھا۔ مگر وہ دن بھی تھے جب مجید کو صرف دو روپے روزانہ ملتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے۔ مگر وہ دن عجیب انداز میں گزرتے تھے۔ بڑے دلچسپ تھے وہ دن۔ بڑی دلچسپ تھیں وہ راتیں، جو لکڑی کے ایک بنچ پہ گزرتی تھیں جس میں ہزارہا کھٹمل تھے، خدا معلوم کتنے عمر رسیدہ۔ کیونکہ وہ بنچ بہت پرانی تھی۔ اس کے مالک نے دس برس پہلے اس کو ایک دوکاندار سے لیا تھا جو اپنا کاروبار سمیٹ رہا تھا۔ اس دوکاندار نے گیارہ برس پہلے اس کا سودا ایک کباڑی سے کیا تھا۔

مجید کو جو مزا، جو لطف اس کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے میں آیا تھا اب اسے اپنے پُرتکلّف سپرنگوں والے پلنگ پر سونے میں نہیں آتا تھا۔ اب اسے ہزاروں کی فکر ہوتی تھی۔ اُس وقت صرف دو روپے روزانہ کی۔ ان دونوں اس کے پاس کینوس کے دو بوٹ تھے اب سینکڑوں تھے۔ مگر وہ بات نہیں تھی۔ ہر روز دن کے کام سے فارغ

ہو کر جب وہ اپنے دفتر کی بنچ پر سونے لگتا تو بوٹ اُتار کر اس پر بلینکو ملتا۔ صبح اُٹھ کر حمام میں اکنی دے کر نہاتا شیو کرتا۔ سامنے ہوٹل میں باہر والے سے کہتا کہ اس کا ناشتہ لے آئے۔ ایک مکھن لگا، بن۔ ایک پیالی چاء۔ لطف آجاتا۔ ناشتہ کر کے وہ پاسنگ شو کا سگریٹ پیتا ایک پان کھاتا اور کام شروع کر دیتا۔

دوپہر کا کھانا وہ بھنڈی بازار میں حاجی کے ہوٹل میں کھاتا۔ یہ ہوٹل کتنا اچھا تھا۔ کھڑی دال گھی میں بگھاری ہوئی کتنی مزیدار ہوتی تھی۔ سکھارا گوشت تو بیحد لذیذ ہوتا تھا۔ پھر برف کا ٹھنڈا پانی۔ پاسنگ شو کا ایک سگریٹ اس کا سارا وجود ہشاش بشاش ہو جاتا تھا۔

کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام کیا، پھر کام شروع کر دیا۔ شام کو چھ بجے فارغ ہوئے۔ ایک آنہ ٹرم پر خرچا اور سیدھے اپالو بندر پہنچ گئے۔ ٹھنڈی ہوا۔ بھانت بھانت کے آدمی۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں۔ وسیع و عریض سمندر۔ اونچی اونچی لہریں۔ کشتیاں۔ موٹریں۔ سائیکلیں۔ خوبصورت عورتیں۔ گجراتی عورتیں۔ مرہٹی عورتیں جو اپنے چمکیلے جوڑوں پہ پھولوں کی وینی لگاتی تھیں۔ پارسی عورتیں۔ یہودی عورتیں۔ تیکھی تیکھی ناک والی۔ اینگلو انڈین اور یورپین عورتیں۔ یہ سب اس کے پاس سے گزرتیں وہ ان کو دیکھتا تو اس کے دل و دماغ کو فرحت پہنچتی۔ اس کو کبھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ ان میں کوئی اس کی ہو جائے۔ لیکن اب

بیوی کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے اس کا جنسی میل جول تھا۔ اب وہ ہر خوبصورت عورت کو شہوانی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ترکیبیں سوچتا کہ کس طرح ان کو حاصل کیا جائے۔

اب بھی وہ سیر کرتا تھا۔ باغوں میں گھومتا تھا مگر پھول اتنے خوبصورت دکھائی نہیں دیتے تھے جتنے کہ اس زمانے میں دکھائی دیتے تھے۔ اب سینکڑوں پھول اس کے گلدانوں میں پڑے رہتے تھے۔ جو مرجھا جانے پر پھینک دیئے جاتے تھے۔ اس کی نگاہ ان پر پڑتی ہی نہیں تھی۔ پڑتی بھی ہوگی تو وہ ان میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا تھا۔

ایک دن اپولو بندر گئے دوسرے دن چوپاٹی چلے گئے۔ وہی بڑے اور چاٹ کھائی۔ گیلی ریت پر بیٹھے۔ سمندر کا نظارہ کرتے رہے۔ دور حدِ نگاہ تک پھیلا سمندر۔ دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتی ہوئی لہریں۔ کشتیوں کے سفید سفید بادبان۔ یہاں سے جی اکتا جاتا تو مالا بار ہل چلے گئے۔ ہینگنگ گارڈنز کیا فرحت بخش مقام تھا۔

اس زمانے میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اس کو ساری دنیا دوست نظر آتی تھی۔ سڑیم اس کی دوست تھی۔ کھلا آسمان اس کا دوست تھا۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ اس کے دوست تھے۔ کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے سے پہلے وہ فٹ پاتھوں پر سویا کرتا تھا۔ ہر چیز اس کو اپنی محسوس ہوتی تھی۔ مگر اب اپنے بھی پرائے لگتے تھے۔

سینکڑوں حریف تھے۔ کاروبار میں، عشق بازیوں میں، ہر جگہ، ہر مقام پر اس کا کوئی نہ کوئی حریف موجود ہوتا تھا۔

وہ زندگی عجیب و غریب تھی۔ یہ زندگی بھی عجیب و غریب تھی مگر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ تفکر سے آزاد تھی یہ تفکر سے پُر چھوٹی سے چھوٹی خوشی اس کے دل و دماغ میں ایک عرصے تک موجود رہتی۔ ایک عرصے تک اس کو شاداں و فرحاں رکھتی۔ چھ آنے دے کر ایک میل ٹیکسی میں بیٹھے تو یہ ایک بہت بڑی عیاشی تھی۔ بھکاری کو ایک پیسہ دیا تو بڑی روحانی مسرت محسوس کی۔ اب وہ سینکڑوں کی خیرات کرتا تھا اور کوئی روحانی مسرت محسوس نہیں کرتا تھا اس لئے کہ یہ محض نمائش کی خاطر ہوتی تھی۔

اس زمانے میں اس کی عیاشیاں بڑی چھوٹی مگر بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ خود کو خوش کرنے کے لئے وہ بڑے نرالے طریقے ایجاد کر لیتا تھا۔

الیکٹرک ٹرین میں بیٹھے اور کسی گاؤں میں جا کر تاڑی پینے لگے۔ پتنگ لیا اور چوپاٹی پر بچوں کے ساتھ اُڑانے لگے۔

وادرا اسٹیشن پر صبح سویرے چلے گئے اور اسکول جانے والی لڑکیاں تاڑتے رہے۔

پُل کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اینگلو انڈین لڑکیاں اسکرٹ پہنے اوپر چڑھتیں تو ان کی ننگی ٹانگیں نظر آتیں۔ اس نظارے سے اس کو بڑی

طفلانہ سی مسرت محسوس ہوتی۔
کبھی کبھی طویل فاصلے پیدل طے کرتا۔ گھر پہونچتا تو اسے خوشی ہوتی کہ اس نے اکنّی یا دونّی بچالی ہے۔ یہ اکنّی یا دونّی وہ کسی ایسی چیز پہ خرچ کرتا جو اس کے روزانہ پروگرام میں نہیں ہوتی تھی۔
کسی لڑکی کو محبت بھرا خط لکھا اور جو پتہ دماغ میں آیا لکھ کر پوسٹ کردیا اور اس حماقت پر دل ہی دل میں خوب ہنسے۔
ایک اُنگلی کا ناخن بڑھا لیا اور کسی دوکان سے ٹشٹ کرنے کے بہانے اس پر کیوٹکس لگا لیا۔
ایک دن صرف دوسروں سے مانگ مانگ کے سگریٹ پیئے اور بیحد شرارت بھری خوشی محسوس کی۔
دفتر میں بنچ کے کھٹملوں نے زیادہ تنگ کیا تو ساری رات بازاروں میں گھومتے رہے اور بجائے کوفت کے راحت محسوس کی۔
جیب میں پیسے کم ہوئے تو دوپہر کا کھانا گول کردیا اور یہ محسوس کیا کہ وہ کھا چکا ہے۔
اب یہ باتیں نہیں تھیں۔ دفتر سے اس نے روپے کمانے کے ڈھنگ سیکھے۔ دولت آنے لگی تو یہ سب باتیں آہستہ آہستہ غائب ہوگئیں۔ اس کی یہ ننھی ننھی مسرتیں سب سونے اور چاندی کے نیچے دب گئیں۔
اب رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں۔ مگر ان سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا تھا جو پُل کے نیچے کھڑے ہوکر ایک خاص زاویے سے ننگی محرّک

ٹانگیں دیکھنے میں محسوس ہوتا تھا۔ اس کی راتیں پہلے بالکل تنہا گزرتی تھیں۔ اب کوئی نہ کوئی عورت اس کے آغوش میں ہوتی مگر وہ سکون غائب تھا۔ وہ کنوارا سکون جس میں وہ رات بھر ملفوف رہتا تھا۔ اب اسے یہ فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ کہیں اس کی بیوی کو پتہ نہ چل جائے۔ کہیں یہ عورت حاملہ نہ ہو جائے۔ کہیں اس کو بیماری نہ لگ جائے۔ کہیں اس عورت کا خاوند نہ آن دھمکے۔ پہلے ایسے تفکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب اس کے پاس ہر قسم کی شراب موجود رہتی تھی، مگر وہ مزا وہ سرور جو اسے پہلے ہر روز شام کو جاپان کی بنی ہوئی "اب ہی" بیئر پینے میں آتا تھا بالکل غائب ہی ہو گیا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر چوپاٹی یا اپولو بندر کی سیر کی۔ خوب گھوڑے پھرے۔ نظاروں کا مزا لیا، آٹھ بجے تو گھر کا رُخ کیا۔ کسی نل سے منہ دھویا اور بائی کھلہ پُل کے پاس والی باریں داخل ہو گئے۔ پارسی سیٹھ کو جو بہت ہی موٹا اور اس کی ناک بڑی بے ہنگم تھی، صاحب جی کہا۔

"کہم سیٹھ سوں حال چھے۔؟"

اس کو بس صرف اتنی گجراتی آتی تھی، مگر جب وہ کہتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی کہ وہ اتنے الفاظ بول سکتا ہے۔ سیٹھ مسکراتا اور کہتا۔

"سارو جی، سارو جی"

پھر وہ پارسی سیٹھ سے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر جنگ کی باتیں چھیڑ دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہاں سے ہٹ کر وہ کونے والی میز کے پاس بیٹھ جاتا۔ یہ اس کی محبوب میز تھی۔ اس کے اوپر کا حصہ سنگِ مرمر کا تھا۔ بیرا اسے گیلے کپڑے سے صاف کرتا اور مجید سے کہتا۔

"بولو سیٹھ"

یہ سُن کر مجید خود کو واقعی سیٹھ سمجھتا۔ اس وقت اس کی جیب میں ایک روپے چار آنے ہوتے۔ وہ بیرے کی طرف دیکھ کر بڑی شان سے مُسکراتا اور کہتا۔

"ہر روز تم مجھ سے پوچھتے ہو سب جانتے ہو — لے آؤ جو پیا کرتا ہوں"

بیرا اپنی عادت کے مطابق جانے سے پہلے گیلے کپڑے سے میز صاف کرتا پونچھ کر ایک گلاس رکھتا۔ ایک پلیٹ میں کابلی چنے، دوسری میں کھاری سینگ یعنی نمک لگی مونگ پھلی لاتا۔

مجید اس سے کہتا۔

"پاپڑ لانا تم ہمیشہ بھول جاتے ہو"

یہ چیزیں گزک کے طور پر بیرے کے ساتھ مفت ملتی تھیں۔ مجید نے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا کہ بیرے سے کابلی چنوں کی ایک پلیٹ اور منگوا لیتا تھا۔ چنے کافی بڑے بڑے ہوتے تھے۔ نمک اور کالی مرچ سے بہت مزیدار بن جاتے تھے۔

بیئر آتی تو وہ بڑے پُر سکون انداز میں اس کو گلاس میں اُنڈیلتا۔ آہستہ آہستہ گھونٹ بھرتا۔ ٹھنڈی یخ بیئر اس کے حلق سے اُترتی تو ایک بڑی عجیب فرحت اس کو محسوس ہوتی۔ اس کو ایسا لگتا کہ ساری دُنیا کی ٹھنڈک اس کے دل و دماغ میں جمع ہوگئی ہے۔ وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا اور سوچتا۔ یہ پارسیوں کی ناک کیوں اتنی موٹی ہے۔ اس قوم نے کیا قصور کیا ہے کہ خدا ان کی ناکوں سے بالکل غافل ہے۔ پرسوں ٹریم میں جو پارسن بیٹھی تھی۔ بڑا سڈول بدن۔ خوبصورت آنکھیں۔ اُبھرا ہوا سینہ۔ بے داغ سفید رنگ۔ ماتھا کُشادہ۔ پتلے پتلے ہونٹ، لیکن یہ بڑی طوطے ایسی ناک۔ اس کو دیکھ کر مجید کو بہت ترس آیا تھا اس نے سوچا تھا کہ آیا ایسی کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی کہ اس کی ناک ٹھیک ہوجائے۔

پھر اس کے دماغ میں مختلف اوقات پر دیکھی ہوئی خوبصورت اور جوان لڑکیاں تیرنے لگتی تھیں اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کا شباب بیئر میں گھول کر پی رہا ہے۔

دیر تک وہاں بیٹھا وہ اپنی زندگی کے حسین لمحات دہراتا رہتا۔

پندرہ دن ہوئے اپولو بندر پر جب تیز ہوا میں ایک یہودن لڑکی کا ریشمی اسکرٹ اُٹھا تھا تو کتنی متناسب اور حسین ٹانگوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔

پچھلے اتوار ایرانی کے ہوٹل میں پائے کا شوربہ کتنا لذیذ تھا۔

کیسے چٹخارے لے لے کر اس نے اس میں گرم گرم نان بھگو کر کھایا تھا۔

رنگین فلم کتنا اچھا تھا۔ رقص کتنا دلفریب تھا ان عورتوں کا۔ آج صبح ناشتے کے بعد سگریٹ پی کر لطف آگیا۔ ایسا لطف ہر روز آیا کرے تو مزے آجائیں۔

وہ میاں بیوی جو اس نے وادر اسٹیشن پر دیکھے تھے، آپس میں کتنے خوش تھے۔ کبوتر اور کبوتری طرح گٹک رہے تھے۔

کیکی مستری بڑا اچھا آدمی ہے۔ کل میں نے اسپرو مانگی تو اس نے مفت دیدی کہنے لگا۔ "اس کے دام کیا لوں گا آپ سے"۔ پچھلے ماہ اس نے وقت پر میری مدد بھی کی تھی۔ پانچ روپے اُدھار مانگے۔ فوراً دیدیئے اور کبھی تقاضا نہ کیا۔

ٹریم میں جب میں نے اس روز مرہٹی لڑکی کو اپنی سیٹ دی تو اس نے کتنی پیاری شکر گذاری سے کہا تھا۔

"تھینک یو۔!"

پھر وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا۔ اس کے چہرے پر بڑی ناک اس کو نظر آتی۔ مجید پھر سوچتا "یہ کیا بات ہے۔ ان پارسیوں کی ناک کے ساتھ اتنا بُرا سلوک کیوں کیا گیا ہے۔ کتنی کوفت ہو رہی ہے اس ناک سے"۔ فوراً ہی اسے خیال آتا کہ یہ پارسی بڑا نیک آدمی ہے کیونکہ وہ اس کو اُدھار دے دیتا تھا۔ جب اس کی جیب میں پیسے نہ ہوتے

تو وہ کاؤنٹر کے پاس جاتا اور اس سے کہتا۔

"سیٹھ آج مال پانی نہیں ۔۔۔ کل !"

سیٹھ مسکراتا۔

"کوئی واندہ نہیں" یعنی کوئی حرج نہیں۔ پھر آجائیں گے۔

بیئر کی بوتل چودہ آنے میں آتی تھی۔ اس کو خالی کر کے اور پلیٹیں صاف کر کے وہ ہاتھ کے بڑے خوبصورت اشارے سے بیرے کو بل لانے کے لئے کہتا۔ بیرا بل لاتا تو وہ اسے ایک روپیہ دیتا اور بڑی شان سے کہتا۔

"باقی دو آنے تم اپنے پاس رکھو"

بیرا سلام کرتا۔ مجید بے حد مسرور اور شاداں اٹھتا اور پارسی سیٹھ کو "صاحب جی" کہہ کر دفتر کی طرف روانہ ہوتا۔ وہاں پہونچتے ہی اس کے قدم رک جاتے۔ پڑوس کی گلی میں ایک چھوٹی سی تاریک کھولی میں مس لینا رہتی تھی۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور ڈانسر تھی مگر اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ یہودن تھی۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایستھر اور ہیلن۔ ایستھر سولہ برس کی تھی اور ہیلن تیرہ برس کی۔ دونوں رات کو اپنی ماں کے پاس ایک لمبا کرتہ پہنے لیٹی ہوتی تھیں۔ صرف ایک پلنگ تھا۔ مس لینا فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی۔

رات کو بیئر پی کے مس لینا کے ہاں جانا مجید کا معمول بن گیا تھا۔ وہ باہر ہوٹل والے کو تین چاء کا آرڈر دے کر گلی میں داخل ہوتا اور مس

لیتا کی کھولی میں پہنچ جاتا۔ اندر ٹین کی کُپّی جل رہی ہوتی۔ ایستھر اور ہیلن قریب قریب نیم برہنہ ہوتیں۔ مجید پہونچتا تو زور سے پکارتا۔

"السلام علیکم"

ماں بیٹیاں ٹھیٹ عربی لہجے میں وعلیکم السلام کہتیں اور وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا اور رس لیتا سے کہتا "چاء کا آرڈر دے آیا ہوں"

ایستھر باریک آواز میں کہتی "تھینک یو" چھوٹی بستر پر لوٹیں لگاتا شروع کر دیتی مجید کو اس کی ننگی ٹانگوں کی کئی جھلکیاں دکھائی دیتیں جو اس کے مسرور و مخمور دماغ کو بڑی فرحت بخشتیں۔

باہر والا چاء لے کر آتا تو ماں بیٹیاں پینا شروع کر دیتیں۔ مجید خاموش بیٹھا رہتا۔ اس تنگ و تاریک ماحول میں ایک عجیب و غریب سکون اس کو محسوس ہوتا۔ وہ چاہتا کہ ان تینوں کا شکریہ ادا کرے۔ اس دھواں دینے والی کپّی کا بھی شکریہ ادا کرے جو دھیمی دھیمی روشنی پھیلا رہی تھی۔ وہ لوہے کی اس کرسی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اس کو نشست پیش کی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر وہ ماں بیٹیوں کے پاس بیٹھتا۔ دونوں لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ ان کی خوبصورتی مجید کی آنکھوں میں بڑی پیاری نیندلے آتی۔ رخصت لیکر وہ اُٹھتا اور جھومتا جھامتا اپنے دفتر میں پہونچ جاتا اور کپڑے بدل کر بنچ پر لیٹتا اور لیٹتے ہی خوشگوار اور پُرسکون نیند کی گہرائیوں میں اُتر جاتا۔

فرصت کے اوقات میں وسکی کے تین چار پگ پی کر جب مجید اس زمانے کو یاد کرتا تو کچھ عرصے کے لئے سب کچھ بھول کر اس میں محو ہو جاتا، نشہ کم ہوتا تو وہ بلیک مارکیٹ کے متعلق سوچنے لگتا۔ روپیہ کمانے کے نئے ڈھنگ تخلیق کرتا۔ ان عورتوں کے متعلق غور کرتا جن سے وہ جنسی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

مجید کا ماضی جنگ سے پہلے کی فضا میں گم ہو چکا تھا۔ ایک مدھم سی لکیر رہ گئی جس کو مجید اب دولت سے پیٹ رہا تھا۔

ننگی آوازیں

بھولو اور گاما دو بھائی تھے۔ بے حد محنتی۔ بھولو قلعی گر تھا۔ صبح دھونکنی سر پر رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں "بھانڈے قلعی کرالو" کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کریانہ ضرور ہوتا۔

گاما خوانچہ فروش تھا۔ اس کو بھی دن بھر چھابڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا تین چار روپے یہ بھی کما لیتا تھا مگر اس کو شراب کی لت تھی۔ شام کو دینے کے بھٹیارخانے سے کھانا کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیئے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چہکتا۔ دینے کے بھٹیارخانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے۔ اور اسی کے سہارے جیتا ہے۔

بھولو نے گاما کو جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب کی لت بہت بری ہے۔ شادی شدہ ہو۔ بیکار پیسہ برباد کرتے ہو۔ یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو بھابی ٹھاٹ

سے رہا کرے۔ ننگی بچی اچھی لگتی ہے تمہیں اپنی گھر والی۔ گاما نے اس کان سُنا۔ اُس کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا سُننا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے۔ ایک بڑی بلڈنگ کے ساتھ سرونٹ کوارٹر تھے۔ ان پر جہاں دوسروں نے قبضہ جما رکھا تھا، وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر کو جو کہ دوسری منزل پر تھا اپنی رہائش کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

سردیاں آرام سے گزر گئیں۔ گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی بھولو تو اوپر کوٹھے پر جا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی۔ اور اوپر پردے کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ایک گاما ہی کو یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلن کو ایک بات سوجھی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے ارد گرد ٹاٹ تان دیا۔ اس طرح پردے کا انتظام ہو گیا۔ کلن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند دنوں ہی میں بانس وغیرہ گاڑ کر، ٹاٹ اور کمبل جوڑ کر پردے کا انتظام کر دیا۔ یوں ہوا تو رک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹر کے دوزخ سے ہر حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔

اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا

تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پالے گا۔ جب گاما کبھی اس کے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا۔

"نا بھائی میں اپنے نردیئے پنڈے پر جوکیں نہیں لگوانا چاہتا۔"

لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اوپر کھاٹ بچھو کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ دن ہی میں اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام دینے کے بھٹیار خانے میں اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ "میری شادی کرو نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

گاما نے جب یہ سُنا تو اُس نے کہا۔ "یہ کیا مذاق سوجھا ہے تمہیں۔؟"

بھولو بہت سنجیدہ ہو گیا۔ "تمہیں نہیں معلوم ... پندرہ راتیں ہو گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے۔"

گاما نے پوچھا۔ "کیوں کیا ہوا۔؟"

"کچھ نہیں یار۔ دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ نیند کیا آئے گی۔ خاک!"

گاما زور سے اپنی گھنی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرما گیا۔ "وہ جو کلن ہے اس نے تو حد ہی کر دی ہے ... سالا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی ... بچے پڑے رو رہے ہیں مگر وہ ....."

گاما حسبِ معمول نشے میں تھا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چہک چہک کر بتایا کہ اس کے بھائی

کو آج کل نیند نہیں آتی' اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز
میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کے بل پڑ گئے۔ جب یہ
لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا
"ہاں بھئی، کلن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے؟" کوئی اس سے کہتا "میاں
مفت میں مزے لیتے ہو — ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو — سو
فیصدی گاتی بولتی"

بعضوں نے گندے گندے مذاق کئے۔ بھولو چڑ گیا۔ گاما صوفی حالت
میں تھا تو اس نے اس سے کہا۔

"تم نے تو یار میرا مذاق بنا دیا ہے — دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا
ہے جھوٹ نہیں۔ میں انسان ہوں۔ خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج
بیس دن ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے۔ تم میری شادی کا بندوبست کر دو' ورنہ
قسم پنج تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا۔ بھابی کے پاس میرا پانسو روپیہ
جمع ہے۔ جلدی کر دو بندوبست۔!"

گاما نے مونچھ مروڑ کر پہلے کچھ سوچا پھر کہا "اچھا ہو جائے گا بندوبست
۔ تمہاری بھابی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ
گچھ کرے"

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات پکی ہو گئی۔ صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ
گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔ خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کاج جانتی تھی۔
ویسے صمد بھی شریف تھا۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو

محنتی تھا۔ تندرست تھا۔

جون کے وسط میں شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ صمد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا۔ مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو نے اپنی دُلہن کے لئے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ ٹاٹ خوب کس کر لگایا۔ چارپائیوں پر نئے کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔ شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کئے۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کو عجیب سا لگا۔ وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کر دیا۔ پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے میں تربتر ہوگیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔

کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا۔؟ کیا آس پاس کے لوگ یہ آوازیں سُنیں گے۔ کیا وہ بھی اسی کے مانند راتیں جاگ جاگ کر کاٹینگے کسی نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہوگیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہتی کہ ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے، پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کی خاموشی میں ہلکی سی سرگوشی بھی دوسرے کانوں تک پہونچ جاتی ہے۔ لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک کوٹھا ہے۔ اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے سینکڑوں آنکھیں، سینکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ پوری تصویر بن کر سامنے آجاتی ہے ——— یہ ٹاٹ کا پردہ کیا ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے — وہ سامنے کلن اپنی بیوی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ وہ کونے میں اس کا بھائی گاما ننگ دھڑنگ لیٹا ہے۔ ادھر عیدو حلوائی کی کنواری بیٹی شادآں کی عریانیت چھدرے ٹاٹ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہے۔

شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے۔ مگر کہاں جاتا۔ اب تو وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صمد ضرور خودکشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزرتی۔ جو طوفان مچتا وہ الگ —

"اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو — میرے ساتھ اور بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی مجھے بھی۔"

بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دلہن کی ڈولی

گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے بھولو اور گاما کو خوب مبارکباد دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے اُنھوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لئے کامیابی کے گُر بتائے۔ بھولو خاموشی سے سُنتا رہا۔ اس کی بھابی نے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردوں کے نیچے بستر کا بندوبست کر دیا۔ گاما نے چار موتیے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیئے ایک دوست اس کے لئے جلیبیوں والا دودھ لے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دُلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بیچاری شرم کی ماری سر نیوڑھائے، گھونگھٹ کاڑھے سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا نیا کُرتہ اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا جھل رہا تھا مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہی ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا۔ نیچے کوارٹر ہی میں رات کاٹے گا مگر جب گرمی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اُٹھا اور دُلہن سے چلنے کو کہا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے۔ کوئی اس کو نہیں دیکھے گا۔ چُپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دُلہن سمیت داخل ہو جائے گا اور صبح اندھیرے نیچے اُتر جائے گا۔

جب وہ کوٹھے پر پہونچا تو بالکل خاموشی تھی۔ دولہن سے شرما رہی

ہوئے قدم اُٹھائے تو پازیب کے نقرئی گھنگھرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونک کر جاگ پڑی ہے۔ چارپائیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے۔ کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں اِدھر اُدھر اُبھریں۔ دبی دبی سرگوشیاں اس تپی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بیوی سے بات کی تو پاس ہی کھُسر پھُسر شروع ہو گئی۔ دور کونے میں جہاں کلن کی جگہ تھی وہاں چارپائی کی چرچوں چرچوں ہونے لگی۔ یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی۔ عید و حلوائی کی کنواری لڑکی شادآں نے دو تین بار اُٹھ کر پانی پیا۔ گھڑے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکراتا تو ایک چھناکا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکی کی چارپائی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولو اپنی دولہن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھُلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے اور ساری چارپائیاں چرچوں چرچوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھری سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاگتی رہی، پھر سو گئی۔

بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اُس کو نیند نہ آئی۔ تھوڑے تھوڑے

وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں۔ آوازیں جو فوراً تصویریں بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔

اس کے دل میں بڑے ولولے تھے۔ بڑا جوش تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ نا آشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی، بڑی راحت بخش گرمی، مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر آوازیں ۔ وہ تصویریں کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کر دیتیں۔ وہ "خود کو ننگا محسوس کرنا۔ الف ننگا، جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صبح چار بجے کے قریب وہ اُٹھا باہر نکل کر اُس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ کچھ سوچا۔ وہ جھجک جو اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کو کسی قدر دور کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کافی تیز تھی۔ بھولو کی نگاہیں کوئے کی طرف مڑیں کلن کا گھسا ہوا ٹاٹ ہل رہا تھا۔ وہ ننگ دھڑنگ لیٹا تھا بھولو کو بڑی گھن آئی۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کوٹھوں پر کیوں چلتی ہے۔ چلتی ہے تو ٹاٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں، سب نوچ ڈالے اور ننگا ہو کے ناچنے لگے۔

بھولو نیچے اُتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی رات کی سرگذشت پوچھی۔ بھوجے درزی نے اس کو دور ہی سے

آوازدی "کیوں استاد بھولو! کیسے رہے، کہیں ہمارے نام پر بٹہ تو نہیں لگادیا تم نے۔؟"

چھاگے ٹین ساز نے بڑے رازدارانہ لہجہ میں اس سے کہا "دیکھو اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتادو۔ ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔"

باتے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپّا مارا "کیوں پہلوان کیسا رہا دنگل۔؟"

بھولو خاموش رہا۔

صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز کے بعد واپس آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند راتیں خاموش رہی تھی۔ لیکن جب وہ اوپر سوئے تو وہی کھسر پھسر وہی چرچوں چرچوں، وہی کھانسنا کھنکارنا۔ وہی گھڑے کے ساتھ گلاس کے ٹکرانے کے چھناکے۔ کروٹوں پر کروٹیں۔ دبی دبی ہنسی۔ بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دلہن کو دیکھ لیتا اور دل میں کڑھتا "مجھے کیا ہوگیا ہے۔ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔"

سات راتوں تک یہی ہوتا رہا، آخر تنگ آکر بھولو نے اپنی بیوی کو میکے بھیجدیا۔ بیس پچیس دن گزر گئے تو گاما نے بھولو سے کہا "یار تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہو۔ نئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیجدیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے۔ تم اکیلے سوتے کیسے ہو۔؟"

بھولو نے صرف اتنا کہا "ٹھیک ہے"

گاما نے پوچھا "ٹھیک کیا ہے — جو بات ہے بتاؤ۔ کیا تمہیں پسند نہیں آئی عائشہ — ؟"

"یہ بات نہیں ہے"

"یہ بات نہیں ہے تو اور کیا بات ہے۔ ؟"

بھولو بات گول کر گیا مگر تھوڑے دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی۔ بھولو اُٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھابی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاما سے کہہ رہی تھی "تم جو کہتے ہو نا کہ بھولو کو عائشہ پسند نہیں آئی" یہ غلط ہے"

گاما کی آواز آئی "تو اور کیا بات ہے — بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں"

"دلچسپی کیا ہو"

"کیوں — ؟"

گاما کی بیوی کا جواب بھولو نہ سن سکا مگر اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہو۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا۔

"نہیں نہیں — یہ تم سے کس نے کہا۔ ؟"

گاما کی بیوی بولی "عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا۔ بات اُڑتی اُڑتی مجھ تک پہونچ گئی"

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گاما نے کہا "یہ تو بہت بُرا ہوا"

بھولو کے دل میں چھُری سی پیوست ہوگئی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اُٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ لگے تھے اُکھیڑنے شروع کر دیئے۔ کھٹا کھٹ پھٹ پھٹ سُن کر لوگ جمع ہو گئے اُنھوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا۔ بات بڑھ گئی۔ کلّن نے بانس اُٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ بھولو چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔

اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے۔ کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اُتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

رام کھلاون

کھٹمل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی۔ میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا۔ میں نے اِس تصویر سے اُس کو پُر کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر دھوبی کا انتظار کرنے لگا۔

ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ ہفتے کی شام کو میرے دُھلے ہوئے کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تھا۔ مجھے اسٹاک تو نہیں کہنا چاہئے اس لئے کہ مفلسی کے اس زمانے میں میرے پاس صرف اتنے کپڑے تھے جو بمشکل چھ سات دن تک میری وضعداری کو قائم رکھ سکتے تھے۔

میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتوار سے میں ماہم جا رہا تھا۔ دھوبی شریف آدمی تھا یعنی دُھلائی نہ ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میرے کپڑے لے آتا تھا' لیکن پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو میری نادہندگی سے تنگ آ کر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کر دے اور مجھے اپنی شادی کی

بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لینا پڑے۔ جو کہ ظاہر ہے بہت ہی معیوب بات ہوتی۔

کھولی میں مرے ہوئے کھٹملوں کی نہایت ہی مکروہ بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح دباؤں کہ دھوبی آگیا۔ "ساب سلام"۔ کہہ کے اس نے اپنی گٹھری کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے میز پر رکھ دیئے ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی۔ ایک دم چونک کر اس نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا اور ایک عجیب و غریب آواز حلق سے نکالی "ہے ہے ہیں۔؟"

میں نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے دھوبی۔؟"

دھوبی کی نظریں تصویر پر جمی رہیں "یہ تو ساعید شالیم بالشٹر ہے؟"

"کون۔؟"

دھوبی نے میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا "ساعید شالیم بالشٹر"

"تم جانتے ہو انھیں۔؟"

دھوبی نے زور سے سر ہلایا "ہاں ۔۔۔ دو بھائی ہوتا۔ ادھر کولابا میں ان کا کوٹھی ہوتا۔ ساعید شالیم بالشٹر۔ میں ان کا کپڑا دھوتا ہوتا"

میں نے سوچا یہ دو برس پہلے کی بات ہو گی کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی جان نے فجی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک برس بمبے میں پریکٹس کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا "دو برس پہلے کی بات

کرتے ہو تم۔"

دھوبی نے زور سے سر ہلایا "ہاں۔ ساعید شالیم بالشٹر جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی دیا۔ ایک دھوتی دیا۔ ایک کُرتہ دیا۔ نیا۔ بہت اچھا لوگ ہوتا۔ ایک کا داڑھی ہوتا۔ یہ بڑا۔" اس نے ہاتھ سے داڑھی کی لمبائی بتائی اور سعید بھائی جان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ چھوٹا ہوتا۔ اس کا تین بادا لوگ ہوتا۔ ڈو لڑکا ایک لڑکی۔ ہمارے سنگ بہت کھیلتا ہوتا۔ کولابے میں کوٹھی ہوتا۔ بہت بڑا....."

میں نے کہا "دھوبی یہ میرے بھائی ہیں۔"

دھوبی نے حلق سے عجیب و غریب آواز نکالی "ہے ہے ہے ہیں؟۔ ساعید شالیم بالشٹر۔؟؟"

میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا "یہ تصویر سعید حسن بھائی جان کی ہے۔ داڑھی والے محمد حسن ہیں۔ ہم سب سے بڑے۔"

دھوبی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی خلاظت کا جائزہ لیا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی بجلی کی لائٹ سے محروم۔ ایک میز تھی۔ ایک کرسی اور ایک ٹاٹ کی کوٹ جس میں ہزارہا کھٹمل تھے۔ دھوبی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں ساعید شالیم بالشٹر کا بھائی ہوں۔ لیکن جب میں نے اس کو ان کی بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے سے جنبش دی اور کہا۔۔

"ساعید شالیم بالشٹر کولابے میں رہتا اور تم اس کھولی میں!"

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا "دُنیا کے یہی رنگ ہیں دھوبی۔ کہیں دھوپ

کہیں چھاؤں کہیں دھوپ۔ پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔"

"ہاں ساب — تم برو بر کہتا ہے" یہ کہکر دھوبی نے گٹھری اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ مجھے اس کے حساب کا خیال آیا۔ جیب میں صرف آٹھ آنے تھے جو شادی کی بات چیت کے سلسلہ میں ماہم تک جانے آنے کے لیے بمشکل کافی تھے۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ میری نیت صاف ہے میں نے اسے ٹھیرایا اور کہا "دھوبی۔ کپڑوں کا حساب یاد رکھنا۔ خدا معلوم کتنی دھلائیاں ہو چکی ہیں۔"

دھوبی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا "ساب، ہم حساب نہیں رکھت — ساعید سالیم بالسٹر کا ایک برس کام کیا۔ جو دے دیا، لے لیا۔ ہم حساب جانت ہی ناہیں۔"

یہ کہکر وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلہ میں ماہم جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

بات چیت کامیاب رہی۔ میری شادی ہو گئی۔ حالات بھی بہتر ہو گئے اور میں سیکنڈ پیر خاں اسٹریٹ کی کھولی سے جس کا کرایہ نو۹ روپے ماہوار تھا کلیئر روڈ کے ایک فلیٹ میں جس کا کرایہ پینتیس ۳۵ روپے ماہوار تھا، اٹھ آیا اور دھوبی کو ماہ بماہ باقاعدگی سے اس کی دھلائیوں کے دام ملنے لگے۔

دھوبی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا "بیگم ساب — ساب کا بھائی ساعید سالیم بالسٹر بہت بڑا آدمی ہوتا — سا دھر کولابہ میں رہتا ہوتا..... جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا — تمہارا ساب بھی ایک دن بڑا آدمی

بنتا ہوتا۔"

میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سُنا چکا تھا اور اس کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ مفلسی کے زمانے میں کتنی دریا دلی سے دھوبی نے میرا ساتھ دیا تھا۔ جب دے دیا جو دیدیا اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی۔ لیکن میری بیوی کو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ حساب نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا۔

"چار برس میرا کام کرتا رہا ہے۔ اس نے کبھی حساب نہیں کیا۔"

جواب یہ ملا "حساب کیوں کرتا۔ ویسے دوگنے چوگنے وصول کر لیتا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ نہیں جانتے۔ جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ان کو ایسے لوگ بے وقوف بنانا جانتے ہیں۔"

قریب قریب ہر مہینے دھوبی سے میری بیوی کی چخ چخ ہوتی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہہ دیتا۔

"بیگم صاب۔ ہم حساب جانت ناہیں۔ تم جھوٹ ناہیں بولے گا۔ سعید شالیم بالشٹر جو تمہارے صاب کا بھائی ہوتا ہے ہم ایک برس اس کا کام کیا ہوتا۔ بیگم صاب بولتا دھوبی تمہارا اتنا پیسہ ہوا۔ ہم بولتا ٹھیک ہے!"

ایک مہینہ ڈھائی سو کپڑے دھلائی میں گئے۔ میری بیوی نے آزمانے کیلئے

اس سے کہا "دھوبی اس مہینے ساٹھ کپڑے ہوئے"

اس نے کہا "ٹھیک ہے۔ بیگم ساب، تم جھوٹ ناہیں بولے گا"

میری بیوی نے ساٹھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دام دیئے تو اس نے ماتھے کے ساتھ روپے چھوا کر سلام کیا اور چلنے لگا۔ میری بیوی نے اسے روکا "ٹھیرو دھوبی۔ ساٹھ نہیں، ڈھائی سو کپڑے تھے۔ لو اپنے باقی روپے میں نے مذاق کیا تھا"

دھوبی نے صرف اتنا کہا "بیگم ساب تم جھوٹ ناہیں بولے گا" باقی کے روپے اپنے ماتھے کے ساتھ چھوا کر سلام کیا اور چلا گیا۔

شادی کے دو برس بعد میں دلی چلا گیا۔ ڈیڑھ برس وہاں رہا، پھر واپس آ گیا اور ماہم میں رہنے لگا۔ تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھوبی تبدیل کئے۔ کیونکہ بے حد بے ایمان اور جھگڑالو تھے۔ ہر دُھلائی پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی کپڑے کم نکلتے تھے، کبھی دُھلائی نہایت ذلیل ہوتی تھی۔ ہمیں اپنا پرانا دھوبی یاد آنے لگا۔ ایک روز جبکہ ہم بالکل بغیر دھوبی کے رہ گئے تھے وہ اچانک آ گیا اور کہنے لگا۔

"ساب کو ہم نے ایک دن بس میں دیکھا۔ ہم بولا، ایسا کیسا۔ ساب تو دلی چلا گیا تھا۔۔۔ ہم نے ادھر بائیکلہ میں تپاس کیا۔ چھاپہ والا بولا، ادھر ماہم میں تپاس کرو۔ باجو والی چال میں ساب کا دوست ہوتا۔ اس سے پوچھا اور آ گیا"

ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔

کانگریس برسرِ اقتدار آئی تو امتناعِ شراب کا حکم نافذ ہو گیا۔ انگریزی شراب ملتی تھی لیکن دیسی شراب کی کشید اور فروخت بالکل بند ہو گئی۔ ننانوے فی صدی دھوبی شراب کے عادی تھے۔ دن بھر پانی میں رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ ہمارا دھوبی بیمار ہو گیا۔ اس بیماری کا علاج اس نے اس زہریلی شراب سے کیا جو ناجائز طور پر کشید کر کے چھپے چوری بکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معدے میں خطرناک گڑبڑ پیدا ہو گئی جس نے اس کو موت کے دروازے تک پہنچا دیا۔

میں بے حد مصروف تھا۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو دس ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا۔ میری بیوی کو جب اس کی خطرناک بیماری کا علم ہوا تو وہ ٹیکسی لے کر اس کے گھر گئی۔ نوکر اور شوفر کی مدد سے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میری بیوی نے کہا "ڈاکٹر صاحب، آپ سارا ثواب حاصل نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر مسکرایا "تو آدھا آدھا کر لیجئے۔"

ڈاکٹر نے آدھی فیس قبول کر لی۔

دھوبی کا باقاعدہ علاج ہوا۔ معدے کی تکلیف چند انجکشنوں ہی سے دور ہو گئی۔ نقاہت تھی، وہ آہستہ آہستہ مقوی دواؤں کے استعمال سے ختم ہو گئی۔ چند مہینوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتا تھا۔ بھگوان سب کو سعید شالیم بالشٹر بنائے۔ ادھر کولابے

میں ساب رہنے کو جائے ۔ باوا لوگ ہوں ۔ بہت بہت پیسہ ہو ۔ بیگم ساب دھوبی کو لینے آیا ۔ موٹر میں ۔ ادھر کلے (قلعے) میں بہت بڑے ڈاکڈر کے پاس لے گیا جس کے پاس میم ہوتا ۔ بھگوان بیگم ساب کو خش رکھے ....."

کئی برس گذر گئے ۔ اس دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے ۔ دھوبی بلاناغہ اتوار کو آتا رہا ۔ اس کی صحت اب بہت اچھی تھی ۔ اتنا عرصہ گزرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں بھولا تھا ۔ شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی ۔ شروع میں وہ کبھی کبھی اسے یاد کیا کرتا تھا پر اب نام تک نہ لیتا تھا ۔ سارا دن پانی میں رہنے کے بعد تھکن دور کرنے کے لئے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی ۔

حالات بہت زیادہ بگڑ گئے ۔ بٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے ۔ ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان اور مسلمانوں کے علاقوں میں ہندو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہلاک کئے جانے لگے ۔ میری بیوی لاہور چلی گئی ۔

جب حالات اور زیادہ خراب ہو گئے تو میں نے دھوبی سے کہا ۔

"دیکھو دھوبی اب تم کام بند کر دو ۔ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے' ایسا نہ ہو تمہیں کوئی مار ڈالے"

دھوبی مسکرایا ۔

"ساب اپن کو کوئی نہیں مارتا"

ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہوئیں مگر دھوبی برابر آتا رہا ۔

ایک اتوار میں گھر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کھیلوں کے صفحے پر کرکٹ کے
۲ میچوں کا اسکور درج تھا اور پہلے صفحے پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور
مسلمانوں کے اعداد و شمار ۔۔۔ میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور
کر رہا تھا کہ دھوبی آگیا۔ کاپی نکال کر میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کی
تو دھوبی ہنس ہنس کے باتیں شروع کر دیں: "ساحید شالیم بالشٹر بہت
اچھا آدمی ہوتا ۔۔ یہاں سے جاتا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک
کرتہ دیا ہوتا۔ تمہارا بیگم ساب بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا ۔۔ باہر گام
گیا ہے نا ؟ ۔۔ اپنے ملک میں ؟ ۔۔ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا اسلام بولو ۔۔۔
موٹر لے کر آیا ہماری کھولی میں ۔ ہم کو اتنا جلاب آتا ہوتا ۔۔ ڈاکڈر نے سوئی
لگایا ۔۔ ایک دم ٹھیک ہو گیا ۔۔ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا اسلام بولو ۔ بولو
رام کھلاون بولتا ہے، ہم کو بھی کاگج لکھو ۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ کر ذرا تیزی سے کہا۔" دھوبی ۔۔ دارو
شروع کر دی ۔ ؟"

دھوبی ہنسا ۔

" دارو ؟ ۔ دارو کہاں ملتی ہے ساب ۔ ؟"

میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے میلے کپڑوں کی گٹھڑی
بنائی اور سلام کر کے چلا گیا۔

چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے ۔ لاہور سے
تار پر تار آنے لگے کہ سب کچھ چھوڑو اور جلدی چلے آؤ۔ میں نے ہفتے

کے روز ارادہ کر لیا کہ اتوار کو چل دونگا۔ لیکن مجھے صبح سویرے نکل جانا تھا۔ کپڑے دھوبی کے پاس تھے۔ میں نے سوچا، کرفیو سے پہلے پہلے اس کے یہاں جا کر لے آؤں، چنانچہ شام کو وکٹوریہ لے کر مہالکشمی روانہ ہو گیا۔

کرفیو کے وقت میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، اس لئے آمدو رفت جاری تھی، ٹریمیں چل رہی تھیں۔ میری وکٹوریہ پُل کے پاس پہونچی تو ایک دم شور برپا ہوا۔ لوگ اندھا دُھند بھاگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی ہے ـــــ ہجوم چھدرا ہوا تو دیکھا، دُور بھٹیوں کے پاس بہت سے دھوبی لاٹھیاں ہاتھ میں لئے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکٹوریہ والے نے انکار کر دیا۔ میں نے اس کو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل پڑا۔ جب دھوبیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک دھوبی سے پوچھا۔

"رام کھلاون کہاں رہتا ہے۔؟"

ایک دھوبی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جھومتا ہوا اس دھوبی کے پاس آیا جس سے میں نے سوال کیا تھا۔

"کیا پوچھت ہے۔؟"

"پوچھت ہے رام کھلاون کہاں رہتا ہے۔؟"

شراب سے دُھت دھوبی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا

"تم کون ہے۔؟"

"میں؟ — رام کھلاون میرا دھوبی ہے"

"رام کھلاون تمہارا دھوبی ہے — تو کس دھوبی کا بچہ ہے۔؟"

ایک چلایا۔

"ہندو دھوبی کا یا مسلمین دھوبی کا۔؟"

تمام دھوبی جو شراب کے نشے میں چور تھے مکے تانتے اور لاٹھیاں گھماتے میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا مسلمان ہوں یا ہندو؟ — میں بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا۔ نزدیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا جس کو مدد کے لئے پکارتا۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کر دی۔

"رام کھلاون ہندو ہے.... ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے — اس کی کھولی کہاں ہے.... دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے.... بہت بیمار تھا۔ ہم نے اس کا علاج کرایا تھا — ہماری بیگم..... ہماری میم صاحب یہاں موٹر لے کر آئی تھی۔ —" یہاں تک میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا۔ دل ہی دل میں بہت خفیف ہو کر انسان اپنی جان بچانے کیلئے کتنی نیچی سطح پر اتر آتا ہے اس احساس نے جرأت پیدا کر دی چنانچہ میں نے ان سے کہا "میں مسلمین ہوں"

"مار ڈالو — مار ڈالو" کا شور بلند ہوا۔

دھوبی جو کہ شراب کے نشے میں دُھت تھا ایک طرف دیکھ کر چلا یا۔
"ٹھیرو۔۔۔ اسے رام کھلاون مارے گا۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا رام کھلاون موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لئے لڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ڈنڈا سر تک اُٹھا کر گالیاں دیتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"رام کھلاون"

رام کھلاون دہاڑا "چپ کر بے رام کھلاون کے۔۔۔"

میری آخری امید بھی ڈوب گئی۔ جب وہ میرے قریب آپہونچا تو میں نے خشک گلے سے ہولے سے کہا۔

"مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون۔۔۔؟"

رام کھلاون نے وار کرنے کے لئے ڈنڈا اُٹھایا۔ ایک دم اُس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑ گئیں۔ ڈنڈا ہاتھ سے گرا کر اس نے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا "ساب!" پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا "یہ مسلمین نہیں ۔۔ یہ میرا ساب ہے ۔۔ بیگم ساب کا ساب۔۔۔۔ وہ موٹر لے کر آیا تھا۔۔۔۔ ڈاکدر کے پاس لے گیا تھا۔ جس نے میرا جُلاب ٹھیک کیا تھا۔"

رام کھلاون نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے ۔۔ سب شرابی تھے۔ تُوتُو میں میں شروع ہوگئی۔ کچھ دھوبی رام کھلاون کی طرف

ہو گئے اور ہاتھا پائی پر نوبت آگئی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔

دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب میرا سامان تیار تھا۔ صرف جہاز کے ٹکٹوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلیک مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔

میں بہت بیقرار تھا۔ دل میں طرح طرح کے جذبات اُبل رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آجائیں اور میں بندرگاہ کی طرف چل دوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر دیر ہو گئی تو میرا فلیٹ مجھے اپنے اندر قید کر لیگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا ٹکٹ آگئے۔ دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا۔

"ساب سلام"

"سلام"

"میں اندر آجاؤں۔؟"

"آجاؤ"

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ گٹھڑی کھول کر اس نے کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھے دھوتی سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"آپ جا رہے ہیں ساب۔؟"

"ہاں"

اس نے رونا شروع کر دیا "ساب، مجھے ماف کر دو۔ یہ سب دارو کا قصور تھا۔۔۔ اور دارو۔۔۔۔ دارو آج کل مُفت ملتی ہے۔ سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ

پی کر مسلمین کو مارو.... مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب..... ہم کو معاف کر دو۔ ہم پئے لا تھا..... ساعید شالیم بالسٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا۔ ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا.... تمہارا بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا۔ جلاب سے ہم مرتا ہوتا۔ وہ موٹر لے کر آتا۔ ڈاکڈر کے پاس لے جاتا۔ اتنا پیسہ خرچ کرتا۔ تم ملک جاتا۔ بیگم ساب سے مت بولنا، رام کھلاون.....“

اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ گٹھڑی کی چادر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا تو میں نے روکا: ”ٹھیرو رام کھلاون“۔

لیکن وہ دھوتی کا لانگ سنبھالتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

شانتی

دونوں پیرے ژین ڈیری کے باہر بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے چاء پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چاء بہت گرم تھی۔ اس لئے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے۔ سامنے موٹی بھوؤں والی یہودن کی جانی پہچانی صورت تھی۔ یہ بڑا گول مٹول چہرہ تیکھی ناک۔ موٹے موٹے بہت ہی زیادہ سُرخی لگے ہونٹ۔ شام کو ہمیشہ درمیان والے دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ مقبول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلرآج سے کہا۔

"بیٹھی ہے جال پھینکنے"

بلرآج موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی مچھلی"

مقبول نے ایک پیسٹری منہ میں ڈالی۔

"یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے۔ کوئی دوکان کھول کر بیٹھتی ہے۔ کوئی چل پھر کے سودا بیچتی ہے۔ کوئی اس طرح ریستوراں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔ جسم بیچنا بھی ایک آرٹ ہے اور میرا خیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے۔ یہ موٹی بھوؤں والی کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہوگی کہ وہ بکاؤ ہے۔"

بلراج مسکرایا۔ "کسی روز وقت نکال کر کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ نگاہوں ہی نگاہوں میں کیونکر سودے ہوتے ہیں۔ اس جنس کا بھاؤ کیسے چکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دم مقبول کا ہاتھ پکڑا "اُدھر دیکھو، اُدھر۔"

مقبول نے موٹی بھوؤں کی طرف دیکھا۔ بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا۔ "نہیں یار۔ اُدھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو۔"

مقبول نے اُدھر دیکھا۔ ایک دُبلی پتلی گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ مقبول نے بلراج سے پوچھا۔

"کون ہے یہ لڑکی۔؟"

بلراج اِس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اماں وہی ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب و غریب ہے۔"

مقبول نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔

"کون سی یار۔ تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو عجیب و غریب ہی ہوتی ہے۔"

بلراج مسکرایا۔

"یہ بڑی خاص الخاص ہے ——— ذرا غور سے دیکھو۔"

مقبول نے غور سے دیکھا۔ بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا۔ ہلکے بسنتی رنگ کی ساڑھی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاؤز۔ پتلی پتلی بہت ہی گوری باہیں۔ لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی۔

"میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب و غریب لڑکی کو سرخی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ اب اور غور سے دیکھا ہے تو ساڑھی کی پہناوٹ میں بھی خامیاں نظر آئی ہیں۔ بال سنوارنے کا انداز بھی ستھرا نہیں۔"

بلراج ہنسا۔

"تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو۔ اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں پڑتی۔"

مقبول نے کہا۔

"جو اچھائیاں ہیں وہ اب بیان فرما دیجئے۔ لیکن پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا....."

لڑکی نے جب بلراج کو دیکھا تو مسکرائی۔ مقبول رک گیا۔

"مجھے جواب مل گیا۔ اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجئے۔"

"سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ جو اصول اس نے اپنے لئے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی

سے عمل کرتی ہے۔ پرسنل، بائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ محبت وحبت کی بالکل قائل نہیں۔ اس معاملے میں دل اس کا برف ہے" بلراج نے جاء کا آخری گھونٹ پیا۔ "کہئے کیا خیال ہے؟"

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا۔

"جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہئیں۔ جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی۔ خود فریبی میں اگر یہ لڑکی کسی مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے"

"یہی میں نے سوچا تھا۔ میں تم سے کیا بیان کروں۔ روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے، اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں۔ ایک گھنٹہ ہو گیا تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی۔ میں چلی' اور یہ جا وہ جا۔ تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے جاؤ چلے جاؤ۔ ساڑھی کو ہاتھ مت لگاؤ میلی ہو جائے گی" یہ کہکر بلراج نے سگریٹ سلگایا "عجیب وغریب لڑکی ہے۔ پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں بائی گوڈ چکرا گیا۔ چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔ فضی سے ایک پیسہ کم نہیں ہوگا، جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں"

مقبول نے پوچھا۔

"نام کیا ہے اس کا۔؟"

"شانتی بتایا اس نے۔ کشمیرن ہے"

مقبول کشمیری تھا۔ چونک پڑا۔

"کشمیرن!"

"تمہاری ہم وطن"

مقبول نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ناک نقشہ صاف کشمیریوں کا تھا۔

"یہاں کیسے آئی۔؟"

"معلوم نہیں"

"کوئی رشتے دار ہے اس کا؟" مقبول لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔

"وہاں کشمیر میں کوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ یہاں بمبئی میں اکیلی رہتی ہے"

بلراج نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبا دیا۔ "ہارنبی روڈ پر ایک ہوٹل ہے، وہاں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ یہ مجھے ایک روز اتفاقاً معلوم ہو گیا ورنہ یہ اپنے ٹھکانے کا پتہ کسی کو نہیں دیتی۔ جس کو ملنا ہوتا ہے یہاں پیرے ٹرین ڈیری میں چلا آتا ہے۔ شام کو پورے پانچ بجے آتی ہے یہاں۔"

مقبول کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بیرے کو اشارے سے بلایا اور اس سے بل لانے کے لئے کہا۔ اس دوران میں ایک خوش پوش نوجوان آیا اور اس لڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ مقبول بلراج سے مخاطب ہوا۔ "اس سے کبھی ملاقات کرنی چاہیئے"

بلراج مسکرایا۔

"ضرور ضرور۔ لیکن اس وقت نہیں مصروف ہے۔ کبھی آجانا یہاں شام کو۔ اور ساتھ بیٹھ جانا"

مقبول نے بل ادا کیا۔ دونوں دوست اُٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے روز مقبول اکیلا آیا اور چاء کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک پانچ بجے وہ لڑکی بس سے اُتری اور پرس ہاتھ میں لٹکائے مقبول کے پاس سے گزر رہی۔ چال بھدّی تھی۔ جب وہ کچھ دور کرسی پر بیٹھ گئی تو مقبول نے سوچا۔ اس میں جنسی کشش تو نام کو بھی نہیں۔ حیرت ہے کہ اس کا کاروبار کیونکر چلتا ہے۔۔۔ لپ اسٹک کیسے بے ہودہ طریقے سے استعمال کی ہے اس نے۔۔۔ ساڑھی کی پہناوٹ آج بھی خامیوں سے بھری ہے۔

پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیسے ملے۔ اس کی چاء میز پر آچکی تھی ورنہ اُٹھ کر وہ اُس لڑکی کے پاس جا بیٹھتا۔ اُس نے چاء پینا شروع کر دی۔ اس دوران میں اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا۔ لڑکی نے دیکھا۔ کچھ توقف کے بعد اُٹھی اور مقبول کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مقبول پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن فوراً ہی سنبھل کر لڑکی سے مخاطب ہوا۔

"چاء شوق فرمائیں گی آپ۔ ؟"

"نہیں۔"

اس کے جوابوں کے اس اختصار میں روکھا پن تھا۔ مقبول نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کشمیریوں کو تو چاء کا بڑا شوق ہوتا ہے۔"

لڑکی نے بڑے بے ہنگم انداز میں پوچھا۔

"تم چلنا چاہتے ہو میرے ساتھ۔ ؟"

مقبول کو جیسے کسی نے اوندھے منہ گرا دیا۔ گھبراہٹ میں وہ صرف اس قدر

کہہ سکتا ہے۔

لڑکی نے کہا "ففٹی روپیہ۔ یس آر نو"

یہ دوسرا ریلا تھا مگر مقبول نے اپنے قدم جما لئے "چلئے"

مقبول نے چائے کا بل ادا کیا۔ دونوں اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی۔ لڑکی بھی خاموش رہی ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے مقبول سے پوچھا۔

"کہاں جانے گا تم۔؟"

مقبول نے جواب دیا۔

"جہاں تم لے جاؤ گی"

"ہم کچھ نہیں جانتا۔ تم بولو کدھر جائے گا۔؟"

مقبول کو کوئی اور جواب نہ سوجھا تو کہا۔

"ہم کچھ نہیں جانتا۔!"

لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"تم کیسا آدمی ہے۔ خالی پیلی جوک کرتا ہے"

مقبول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں مذاق نہیں کرتا۔ مجھے تم سے صرف باتیں کرنی ہیں"

وہ بگڑ کر بولی "کیا۔ تم تو بولا تھا ففٹی روپئیز یس!"

مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے "یہ لو، گھبراتی کیوں ہو۔؟"

اس نے نوٹ لے لیے۔

"تم جائے گا کہاں۔ ؟"

مقبول نے کہا "تمہارے گھر"

"نہیں"

"کیوں نہیں۔ ؟"

"تم کو بولا ہے نہیں۔ ادھر ایسی بات نہیں ہوگی"

مقبول مسکرایا "ٹھیک ہے ایسی بات ادھر نہیں ہوگی"

وہ کچھ متحیر سی ہوئی "تم کیسا آدمی ہے۔ ؟"

"جیسا میں ہوں۔ تم نے بولا ففٹی روپیز لیں گے تو۔ میں نے کہا لیں اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیئے۔ تم نے بولا ادھر ایسی بات نہیں ہوگی۔ میں نے کہا بالکل نہیں ہوگی۔ اب اور کیا کہتی ہو"

لڑکی سوچنے لگی۔۔۔ مقبول مسکرایا۔

"دیکھو شانتی بات یہ ہے۔ کل تم کو دیکھا۔ ایک دوست نے تمہاری کچھ باتیں سنائیں جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں۔ آج میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ اب تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر تم سے باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔ کیا تمہیں یہ منظور نہیں"

"نہیں۔۔ یہ لو اپنے ففٹی روپیز" لڑکی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔

"تمہیں بس ففٹی روپیز کی پڑی ہے۔ روپے کے علاوہ بھی دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔ چلو، ڈرائیور کو اپنا اڈریس بتاؤ۔ میں شریف

آدمی ہوں۔ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔" مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی۔ لڑکی متاثر ہوئی۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔

"چلو — ڈرائیور ہاربی روڈ!"

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیئے۔ "یہ میں نہیں لونگی۔"

مقبول نے اصرار نہ کیا۔ "تمہاری مرضی۔"

ٹیکسی ایک پانچ منزل بلڈنگ کے پاس رکی۔ پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے تھے۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لئے مخصوص تھی۔ بڑی تنگ و تاریک جگہ تھی۔ چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بہت مختصر سامان تھا۔ لوہے کا ایک پلنگ جس پر اُجلی چادر بچھی تھی۔ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل۔ ایک اسٹول، اس پر ٹیبل فین۔ چار ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔

مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دونوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے۔ مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے اسے روکا۔ "نہیں۔ اِدھر بیٹھنے کا اجازت نہیں۔ ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ کرسی پر بیٹھو۔"

یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔

شانتی نے اپنا پرس تکیے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا۔

"کیا باتیں کرنا چاہتے ہو۔؟"

مقبول نے شانتی کی طرف غور سے دیکھا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہوٹلوں

پر لپ اسٹک لگانی بالکل نہیں آتی۔"

شانتی نے بُرا نہ مانا۔ صرف اتنا کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"اُٹھو مجھے لپ اسٹک دو۔ میں تمہیں سکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر مقبول نے اپنا رومال نکالا۔

شانتی نے اس سے کہا۔ "ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہے اُٹھا لو۔"

مقبول نے لپ اسٹک اُٹھائی۔ اُسے کھول کر دیکھا۔

"ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پونچھوں۔"

"تمہارے رومال سے نہیں۔ میرا لو۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹرنک کھولا اور ایک دھلا ہوا رومال مقبول کو دیا۔ مقبول نے اُس کے ہونٹ پونچھے۔ بڑی نفاست سے نئی سُرخی ان پر لگائی۔ پھر کنگھی سے اس کے بال ٹھیک کئے اور کہا۔

"لو اب آئینہ دیکھو۔"

شانتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوگئی، بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معائنہ کیا۔ پسندیدہ نظروں سے تبدیلی محسوس کی۔ اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا۔ "اب ٹھیک ہے۔" پھر پلنگ پر بیٹھ کر کہا۔ "تمہارا کوئی بیوی ہے۔؟"

مقبول نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ مقبول چاہتا تھا باتیں ہوں چنانچہ اس نے سلسلہ

کلام شروع کیا "اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ تم کشمیر کی رہنے والی ہو۔ تمہارا نام شانتی ہے۔ یہاں رہتی ہو۔ یہ بتاؤ تم نے ففٹی روپیہ کا معاملہ کیوں شروع کیا۔ ؟"

شانتی نے بے تکلف جواب دیا "میرا فادر سرینگر میں ڈاکٹر ہے۔ میں وہاں ہوسپیٹل میں نرس تھی۔ ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا۔ میں بھاگ کر ادھر کو آگئی۔ یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیہ دیا۔ بولا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم گیا۔ بس کام چالو ہو گیا۔ ہم یہاں ہوٹل میں آگیا۔ پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی۔ سب رنڈی لوگ ہے کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔"

مقبول نے کرید کرید کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتہ چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جب اس کا ذکر آیا تو اس نے برا سا منہ بنا کر کہا

"آئی ڈونٹ لائک۔ ییٹ از بیڈ"

اس کے نزدیک ففٹی روپیہ کا معاملہ ایک کاروباری معاملہ تھا۔ سرینگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے۔ شانتی کو بہت غصہ آیا۔ نوٹ پھاڑ دیا۔ اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا۔ پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی۔ اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لئے بڑی محتاط رہتی تھی۔

ایک برس ہو گیا تھا اسے بمبئی آئے ہوئے۔ اس دوران میں اس نے دھنراج

روپے بچائے ہوتے مگر اس کو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی۔ پچھلی ریسوں پر اسکے پانچہزار اُڑ گئے۔ لیکن اُس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی۔

"ہم اپنا لوس پورا کرلے گا"

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سو روپے روزانہ کما لیتی تھی جو فوراً بنک میں جمع کرا دیئے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ وہ نہیں کمانا چاہتی تھی۔ اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور مقبول سے کہا "اب تم جاؤ۔ ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا"۔ مقبول اُٹھ کر جانے لگا تو اس نے کہا "باتیں کرنے آؤ تو صبح کے ٹائم آؤ۔ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتی ہے"۔

مقبول نے "اچھا" کہا اور چل دیا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب مقبول شانتی کے پاس پہونچا۔ اسکا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کریگی مگر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا اس دوران میں شانتی کو صحیح طریقے پر ساڑھی پہننی سکھائی۔ لڑکی ذہین تھی جلدی سیکھ گئی۔

کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے۔ یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے۔ اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا۔ شباب بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رُک گئی تھی ایک ایسے مقام پر ٹھیر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا۔ وہ خوبصورت تھی نہ بدصورت، عورت تھی نہ لڑکی۔ وہ پھول تھی نہ کلی، شاخ تھی نہ تنا۔ اِس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت اُلجھن ہوتی تھی

وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے خلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔
شانتی کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لئے مقبول نے اس سے ہر دوسرے تیسرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارات نہیں کرتی تھی لیکن اب اس اُس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دیدی تھی۔ ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا جب شانتی نے اُس سے کہا۔
"تم کوئی لڑکی مانگتا۔؟"
مقبول لیٹا ہوا تھا چونک کر اُٹھا "کیا کہا۔؟"
شانتی نے کہا "ہم پوچھتی، تم کوئی لڑکی مانگتا تو ہم لاکر دیتا۔"
مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا۔ کیوں اس نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہوگئی۔ مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے بتایا کہ مقبول اسے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے۔ اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جبکہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے۔ مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں۔ مقبول کو عورت کی ضرورت ہے کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔
مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ایک دم وہ اُٹھی اور چلانے لگی "ہم کچھ بھی نہیں ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ ہمارے پاس کیوں آتا ہے آتا ہے تم۔ جاؤ"
مقبول نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اُٹھا اور چلا گیا۔
متواتر ایک ہفتہ وہ پیرے ژین ڈیری جاتا رہا۔ مگر شانتی دکھائی نہ دی۔
آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رُخ کیا۔ شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر

کوئی بات نہ کی۔ مقبول کرسی پر بیٹھ گیا۔ شانتی کے ہونٹوں پر سُرخی پُرانے بھدّے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی بُرا تھا۔ ساڑھی کی پہناوٹ تو اور زیادہ بدزیب تھی۔ مقبول اس سے مخاطب ہوا۔

"مجھ سے ناراض ہو تم۔؟"

شانتی نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول نے تُند لہجے میں پوچھا۔

"بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا۔؟"

شانتی خاموش رہی۔ مقبول نے غصّے میں کہا۔

"جواب دو ورنہ یاد رکھو مار دوں گا۔"

شانتی نے صرف اتنا کہا "مارو۔"

مقبول نے اُٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا۔ شانتی بلبلا اُٹھی۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا۔ غصّے میں اس کے ہونٹوں کی بھدّی سُرخی پونچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا۔ لپ اسٹک اُٹھا کر نئی سُرخی لگائی۔ کنگھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"ساڑھی ٹھیک کروا لی۔"

شانتی اُٹھی اور ساڑھی ٹھیک کرنے لگی مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا۔ مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا۔ جب شانتی کے رونے کی شدّت کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا۔

"شانتی اُٹھو۔ میں جا رہا ہوں۔"

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی۔ اور چلائی "نہیں نہیں۔ تم نہیں جا سکتے"
اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان میں کھڑی ہو گئی "تم گئے تو
مار ڈالوں گی"

وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا
تھا جیسے گہری نیند سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے
سامنے شانتی کے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں
چمک رہی تھیں۔ سُرخی لئے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ ایک
دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیہوڑا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا
اسکے آنسو بند ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔ مقبول نے اس کو پیار کیا' رونا بند کرنے
کے لئے کہا تو وہ آنسوؤں میں اٹک اٹک کر بولی "ادھر سرینگر میں۔ ایک
آدمی نے۔ ہم کو مار دیا تھا۔ ادھر ایک آدمی نے۔ ہم کو زندہ کر دیا"

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے
نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کر کہا "یہ لو اپنے فضٹی روپیز"

شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اُٹھائے اور پھینک دیئے۔
پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کا ایک دراز کھولا اور مقبول سے
کہا "ادھر آؤ۔ دیکھو یہ کیا ہے۔؟"

مقبول نے دیکھا دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ مٹھی
بھر کے شانتی نے اُٹھائے اور ہوا میں اُچھالے "ہم اب یہ نہیں مانگتا"

مقبول مسکرایا۔ ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر چھوٹی سی چپت لگائی اور پوچھا "اب تم کیا مانگتا ہے!"

شانتی نے جواب دیا "تم کو" یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چمٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا "روؤ نہیں۔ تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے"

Normal

سہانے

"یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں - یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں - اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں، ٹریجڈی میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے - ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے، لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا - اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا ہے، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی - وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب فنا کر دیئے جا سکتے ہیں - مذہب دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت - یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں، روح میں ہوتا ہے - چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟"

ممتاز اس روز بہت ہی پُرجوش تھا - ہم صرف تین تھے جو اُسے جہاز پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے - وہ ایک غیر متعین عرصے کے لئے ہم سے جُدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا - پاکستان، جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم

گمان بھی نہ تھا۔

ہم تینوں ہندو تھے۔ مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اس کا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اسی صدمے کے زیرِ اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا "میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔"

ممتاز نے اس سے پوچھا "کیا کرو گے۔؟"

جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔"

یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ کی جگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روانگی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے "میں یہ سوچ رہا ہوں بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔" غالباً وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں۔ ممتاز کو جو کہ اس کا جگری دوست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتونی ہو گیا تھا۔ خاص

طور پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے۔

صبح اُٹھتے ہی اُس نے پینا شروع کر دی۔ اسباب وغیرہ کچھ اس انداز کا باندھا اور بندھوایا جیسے وہ کہیں سیر و تفریح کے لئے جا رہا ہے۔ خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہنستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں ناقابلِ بیان مسرت محسوس کر رہا ہے، لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے جذبات چھپانے کے لئے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے بہت چاہا کہ اُس سے اُس کی یک لخت روانگی کے متعلق بات کروں اشارتاً میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے۔ مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقعہ ہی نہ دیا۔

جگل تین چار پیگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔ میں اور برجموہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے۔ ڈاکٹروں کی فیسیں دینی تھیں۔ لانڈری سے کپڑے لانے تھے۔ یہ سب کام اس نے ہنستے کھیلتے کئے، لیکن جب اس نے ناکے کے ہوٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ برجموہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا "یاد ہے کہ بریچ۔ آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتلا تھا۔ گوبند نے ہمیں ایک روپیہ اُدھار دیا تھا"

راستے میں ممتاز خاموش رہا۔ مگر گھر پہونچتے ہی اُس نے بچوں کا لامتناہی

سلسلہ شروع کر دیا' ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر لیکن وہ کچھ ایسی پُر خلوص تھیں کہ میں اور برجموہن برابر ان میں حصّہ لیتے رہے۔ جب روانگی کا وقت قریب آیا تو جگل بھی شامل ہو گیا' لیکن جب ٹیکسی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو گئے۔

ممتاز کی نظریں بمبئی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہیں' حتیٰ کہ ٹیکسی اپنی منزلِ مقصود تک پہونچ گئی۔ بے حد بھیڑ تھی۔ ہزارہا ریفیوجی جا رہے تھے۔ خوشحال کم اور بدحال بہت زیادہ۔ بے پناہ ہجوم تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اسکی دیکھی بھالی نہیں۔ جو اسکے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔

جب کیبن میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرشے پر لے گیا۔ اِدھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے' ممتاز دیر تک دیکھتا رہا' پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا "یہ محض فریبِ نظر ہے۔ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا۔ لیکن یہ فریبِ نظر کس قدر دلفریب ہے۔ یہ ملاپ!" جگل خاموش رہا۔ غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اسکی یہ کہی ہوئی بات چٹکیاں لے رہی تھی۔ "میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں"۔

ممتاز نے جہاز کی بار سے برانڈی منگوائی' کیونکہ وہ صبح سے یہی پی رہا تھا۔ ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ریفیوجی دھڑا دھڑ جہاز میں سوار ہو رہے تھے۔ اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلا رہے

تھے۔ جگل نے دفعتاً ایک ہی جُرعے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا "مجھے معاف کر دینا ممتاز۔ میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دُکھ پہنچایا تھا"۔

ممتاز نے تھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا "جب تم نے کہا تھا' میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔ کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا۔ نیک دِلی سے اسی نتیجے پر پہونچے تھے"۔

جگل نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لیکن مجھے افسوس ہے"۔

"تم مجھے مار ڈالتے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا" ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا "لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو۔ ایک مسلمان کو۔ ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے — وہ اگر حرامزادہ تھا تو اس کی حرمزدگی کو نہیں بلکہ خود اس کو مار ڈالا ہے۔ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مُسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے۔ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا' لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا"۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا "ہو سکتا ہے' میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے' لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلّانا شروع کر دیتا۔ مجھے شہادت کا یہ رُتبہ قبول نہیں۔ مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیئے جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔ لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا۔ تم نے یہ خبر بمبئی میں سُنی اور مجھے

قتل کر دیا۔ بتاؤ، تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟۔ اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔ میں تو یہ کہوں گا، مرنیوالے کتے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار۔ بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے۔"

باتیں کہتے کرتے ممتاز بہت زیادہ جذباتی ہو گیا۔ لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا۔ میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، یقین، دھرم، عقیدت۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے۔ جو چھرے، چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔"

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے بےچینی سے کہا "نہیں بالکل ٹھیک نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اچھی طرح ادا نہیں کر سکا۔ مذہب سے میری مراد، یہ مذہب نہیں، یہ دھرم نہیں، جس میں ہم میں سے ننانوے فی صدی مبتلا ہیں۔ میری مراد اس خاص چیز سے ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں جدا گانہ حیثیت بخشتی ہے۔ وہ چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے۔ لیکن یہ چیز کیا ہے؟۔ افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر نہیں دکھا سکتا۔" یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کیا۔ "لیکن

اس میں وہ کونسی خاص بات تھی ؟ — کٹر ہندو تھا — پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی ؟"

میں نے پوچھا "کس کی ۔ ؟"

"ایک بھڑوے کی ۔"

ہم تینوں چونک پڑے ۔ ممتاز کے لہجہ میں کوئی تکلف نہیں تھا' اس لئے میں نے سنجیدگی سے پوچھا "ایک بھڑوے کی ۔ ؟"

ممتاز نے اثبات میں سر ہلایا "مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرفِ عام میں ایک بھڑوا تھا — عورتوں کا دلّال — لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا ۔"

ممتاز تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے ۔ چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا "اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں — کچھ سہائے تھا — بنارس کا رہنے والا بہت ہی صفائی پسند ۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا ۔ پردے کا معقول انتظام تھا ۔ چارپائیاں اور پلنگ نہیں تھے لیکن گدیلے اور گاؤ تکیے موجود تھے ۔ چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اُجلے رہتے تھے ۔ نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا ۔ صرف صفائی ہی نہیں' ہر کام — اور وہ سر سے بلا کبھی نہیں ٹالتا تھا ۔ دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا ۔ رات زیادہ گذر گئی ہے اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف

کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجئے۔ اگر کسی لڑکی کے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپاتا نہیں تھا۔ اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصہ میں بیس ہزار روپے کما چکا ہے۔ ہر دس میں سے ڈھائی کمیشن کے لے لے کر۔ اسے صرف دس ہزار اور بنانے تھے۔ معلوم نہیں صرف دس ہزار اور کیوں، زیادہ کیوں نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور بزازی کی دوکان کھولے گا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دوکان کھولنے کا آرزومند کیوں تھا۔"

میں یہاں تک سُن چکا تو میرے منہ سے نکلا: "عجیب و غریب آدمی تھا۔"

ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی: "میرا خیال تھا کہ وہ سرتاپا بناوٹ ہے۔ ایک بہت بڑا فراڈ ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو جو اس کے دھندے میں شریک تھیں۔ اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ یہ بھی اس وقت میرے لئے بعید از فہم تھا اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹس کھول رکھا تھا۔ اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کراتا تھا اور یہ بات تو بالکل ناقابلِ یقین تھی کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔ اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا امینہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں۔ میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دیدیتا ہوں تاکہ باہر جا کر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں۔ یہاں تو آپ

جانتے ہیں سب ویشنو ہیں — میں یہ سُنکر دل ہی دل میں مُسکرایا کہ مجھے بنا رہا ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرادی تھی۔ لاہور سے خط لکھا ہے کہ داتا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی اب اس نے سہائے کے لئے منّت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جاکر بزازی کی دوکان کھول سکے۔ یہ سُن کر تو میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا، چونکہ میں مسلمان ہوں، اس لئے مجھے خوش کرنیکی کوشش کر رہا ہے۔"

میں نے ممتاز سے پوچھا: "تمہارا خیال غلط تھا؟"

"بالکل — اس کے قول و فعل میں کوئی بعد نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو، بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں — مگر وہ ایک بہت ہی عمدہ انسان تھا۔"

جگل نے سوال کیا: "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا — ؟"

"اس کی موت پر" یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اُدھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے۔ "فسادات شروع ہو چکے تھے — میں علی الصبح اُٹھ کر بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا — کرفیو کے باعث بازار میں آمد و رفت بہت ہی کم تھی۔ ٹریم بھی نہیں چل رہی تھی۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا، تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو میں نے

بڑے سے ٹوکرے کے پاس گٹھڑی سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پاٹی والا (مزدور) سو رہا ہے۔ لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لوتھڑے دیکھے تو رُک گیا۔ واردات قتل کی تھی۔ میں نے سوچا اپنا راستہ لوں، مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں پھر رک گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا میں نے جُھک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا، مگر خون کے دھبّوں سے بھرا ہوا۔ میں اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا۔ اس کی ٹول کی سفید جو ہمیشہ بے داغ ہوا کھیتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی۔ زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا اس لئے ہولے ہولے کراہنا شروع کیا تو میں نے احتیاط سے اُس کا کندھا پکڑ کر ہلایا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے ایک دو بار میں نے اسکو نامکمل نام سے پکارا بھی ۔۔۔ میں اُٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ دیر تک وہ ان ادھ کھُلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم اس کے سارے بدن میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا "آپ ؟۔ آپ۔ ؟"

میں نے اس سے تلے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دیں۔ وہ کیسے ادھر آیا۔ کس نے اس کو زخمی کیا۔ کب سے وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں ؟

اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ جب میں نے سارے سوال کر ڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے "میرے دن پورے ہو چکے تھے۔ بھگوان کو یہی منظور تھا"

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا، لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے، اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس کے مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا وہ بھی مسلمان تھا۔ میں ڈرپوک تو نہیں، لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف یہ خوف دامنگیر تھا، ممکن ہے میں ہی پکڑا جاؤں، دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ گچھ کے لئے دھر لیا جاؤں گا۔ ایک بار خیال آیا، اگر میں اسے ہسپتال لے گیا تو کیا پتہ اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے۔ سوچا، مرنا تو ہے، کیوں نہ اسے ساتھ لیکر مروں۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا۔۔ میں ٹھیر گیا۔ نہ ٹھیرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے۔ میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا، گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں مجھے جانا ہے۔ اس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے بڑی مشکلوں سے اپنی قمیص کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا، مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا۔ "نیچے بنڈی ہے۔ اِدھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں۔۔ یہ سلطانہ کا مال ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔۔ میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا۔ آج اسے۔ آج اسے بھیجنے والا تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔۔ آپ اسے دیدیجئے گا اور۔۔ کہئے گا فوراً چلی جائے۔۔۔

لیکن ..... اپنا خیال رکھئے گا۔!"

ممتاز خاموش ہوگیا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اُسکی آواز سہاسے کی آوازیں جو جے جے ہسپتال کے سامنے فٹ پاتھ پر ابھری تھی، دور، ادھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں مدغم تھے، حل ہورہی ہے۔ جہاز نے وسل دیا تو ممتاز نے کہا "میں سُلطانہ سے ملا۔ اُسکو زیور اور روپیہ دیا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔"

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اُترے تو وہ عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اِس کا داہنا ہاتھ ہل رہا تھا۔ میں جُگل سے مخاطب ہوا "کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز سہاسے کی روح کو بُلا رہا ہے۔۔ ہم سفر بنانے کے لئے۔"

جُگل نے صرف اتنا کہا "کاش میں سہاسے کی روح ہوتا!"

خالی بوتلیں خالی ڈبّے!

یہ حیرت مجھے اب بھی ہے کہ خاص طور پر خالی بوتلوں اور ڈبّوں سے مجرّد مردوں کو اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟ — مجرّد مردوں سے میری مراد اُن مردوں سے ہے جن کو عام طور پر شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

یوں تو اس قسم کے مرد عموماً سنکی اور عجیب و غریب عادات کے مالک ہوتے ہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہیں خالی بوتلوں اور ڈبّوں سے کیوں اتنا پیار ہوتا ہے؟ — پرندے اور جانور اکثر ان لوگوں کے پالتو ہوتے ہیں۔ یہ میلان سمجھ میں آسکتا ہے کہ تنہائی میں ان کا کوئی تو مونس ہونا چاہیئے، لیکن خالی بوتلیں اور خالی ڈبّے ان کی کیا غمگساری کر سکتے ہیں؟

سنک اور عجیب و غریب عادات کا جواز ڈھونڈھنا کوئی مشکل نہیں کہ فطرت کی خلاف ورزی ایسے بگاڑ پیدا کر سکتی ہے، لیکن اس کی نفسیاتی باریکیوں میں جانا البتہ بہت مشکل ہے۔

میرے ایک عزیز ہیں۔ عمر آپ کی اس وقت پچاس کے قریب ہے۔ آپ کو کبوتر اور کتّے پالنے کا شوق ہے اور اس میں کوئی عجیب و غریب

لیکن آپ کو یہ مرض ہے کہ بازار سے ہر روز دودھ کی بالائی خرید کر لاتے ہیں۔ چولھے پر رکھ کر اس کا روغن نکالتے ہیں اور اس روغن میں اپنے لئے علیحدہ سالن تیار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح خالص گھی تیار ہوتا ہے۔

پانی پینے کے لئے اپنا گھڑا الگ رکھتے ہیں۔ اس کے منہ پر ہمیشہ ململ کا ٹکڑا بندھا رہتا ہے تاکہ کوئی کیڑا مکوڑا اندر نہ چلا جائے، مگر ہوا برابر داخل ہوتی رہے۔

یا خانے جاتے وقت سب کپڑے اُتار کر ایک چھوٹا سا تولیہ باندھ لیتے ہیں اور لکڑی کی کھڑاؤں پہن لیتے ہیں۔ اب کون ان کی بالائی کے روغن، گھڑے کی ململ، انگ کے تولئے اور لکڑی کی کھڑاؤں کے نفسیاتی عقدے کو حل کرتے بیٹھے۔

میرے ایک مجرّد دوست ہیں۔ بظاہر بڑے ہی نورمل انسان۔ ہائی کورٹ میں ریڈر ہیں۔ آپ کو ہر جگہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے۔ چنانچہ ان کا رومال سدا ان کی ناک سے چپکا رہتا ہے۔ آپ کو خرگوش پالنے کا شوق ہے۔

ایک اور مجرّد ہیں۔ آپ کو جب موقعہ ملے نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ کا دماغ بالکل صحیح ہے۔ سیاساتِ عالم پر آپ کی نظر بہت وسیع ہے۔ طوطوں کو باتیں سکھلانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

ملٹری کے ایک میجر ہیں۔ سن رسیدہ اور دولت مند۔ آپ کو حُقّے جمع کرنے کا شوق ہے۔ گڑگڑیاں، پیچوان، چموڑے، غرضکہ ہر قسم کا حُقّہ اُن کے پاس موجود ہے۔ آپ کئی مکانوں کے مالک ہیں، مگر ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لیکر رہتے ہیں۔ بٹیریں آپ کی جان ہیں۔

ایک کرنل صاحب ہیں۔ ریٹائرڈ۔ بہت بڑی کوٹھی میں اکیلے دس بارہ

چھوٹے بڑے کتّوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہر برانڈکی وسکی ان کے یہاں موجود رہتی ہے۔ ہر روز شام کو چار پیگ پیتے ہیں اور اپنے ساتھ کسی نہ کسی لاڈلے کتّے کو بھی پلاتے ہیں۔

میں نے اب تک جتنے میجروں کا ذکر کیا ہے سب کو حسبِ توفیق خالی بوتلوں اور ڈبّوں سے دلچسپی ہے۔ میرے دودھ کی بالائی سے خالص گھی تیار کرنے والے عزیز، گھر میں جب بھی کوئی خالی بوتل دیکھیں تو اسے دھو دھا کر اپنی الماری میں سجا دیتے ہیں کہ ضرورت کے وقت کام آئے گی۔ ہائیکورٹ کے ریڈر جن کو ہر جگہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے صرف ایسی بوتلیں اور ڈبّے جمع کرتے ہیں، جن کے متعلق وہ اپنا پورا اطمینان کر لیں کہ اب ان سے بدبو آنیکا کوئی احتمال نہیں رہا۔ جب موقعہ ملے، نماز پڑھنے والے، خالی بوتلیں آبِ دست کیلئے اور ٹین کے خالی ڈبّے وضو کیلئے درجنوں کی تعداد میں جمع رکھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق یہ دونوں چیزیں سستی اور پاکیزہ رہتی ہیں۔ قسم قسم کے خُقّے جمع کرنے والے میجر صاحب کو خالی بوتلیں اور خالی ڈبّے جمع کر کے ان کو بیچنے کا شوق ہے اور ریٹائرڈ کرنل صاحب کو صرف وہسکی کی خالی بوتلیں جمع کرنے کا۔

آپ کرنل صاحب کے ہاں جائیں تو ایک چھوٹے، صاف ستھرے کمرے میں کئی شیشے کی الماریوں میں آپ کو وہسکی کی خالی بوتلیں سجی نظر آئینگی۔ پرانے سے پرانے برانڈ کی وہسکی کی خالی بوتل بھی آپ کو ان کے اس نادر مجموعے میں مل جائے گی۔ جس طرح لوگوں کو ٹکٹ اور سکّے جمع کرنے کا شوق بلکہ خبط ہے۔

کرنل صاحب کا کوئی عزیز، رشتہ دار نہیں۔ کوئی ہے تو اس کا مجھے علم نہیں۔

دُنیا میں تن تنہا ہیں لیکن وہ تنہائی بالکل محسوس نہیں کرتے۔ دس بارہ کُتے ہیں
اِن کی دیکھ بھال وہ اس طرح کرتے ہیں جس طرح شفیق باپ اپنی اولاد کی کرتے ہیں
سارا دن اُن کا اِن حیوانوں کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ فرصت کے وقت وہ
الماریوں میں اپنی چہیتی بوتلیں سنوارتے رہتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے، خالی بوتلیں تو ہوئیں یہ تم نے خالی ڈبے کیوں ساتھ لگا دیئے؟
-کیا یہ ضروری ہے کہ تجرّد پسند مردوں کو خالی بوتلوں کے ساتھ ساتھ خالی ڈبوں کی بھی دلچسپی ہو؟۔ اور پھر ڈبے اور بوتلیں صرف خالی کیوں؟ بھری ہوئی کیوں نہیں؟
-میں آپ سے شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے خود بھی اس بات کی حیرت ہے۔
یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے سوال اکثر میرے دماغ میں پیدا ہو چکے ہیں۔ باوجود کوشش کے میں ان کا جواب حاصل نہیں کر سکتا۔

خالی بوتلیں اور خالی ڈبے، خلا کا نشان ہیں اور خلا کا کوئی منطقی جوڑ تجرّد پسند مردوں سے غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ خود اِن کی زندگی میں ایک خلا ہوتا ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا وہ اس خلا کو ایک اور خلا سے پُر کرتے ہیں؟ کُتے بلّیوں، خرگوشوں اور بندروں کے متعلق آدمی سمجھ سکتا ہے کہ وہ خالی خولی زندگی کی کمی ایک حد تک پوری کر سکتے ہیں کہ وہ دل بہلا سکتے ہیں ناز نخرے کر سکتے ہیں دلچسپ حرکات کے موجب ہو سکتے ہیں، پیار کا جواب بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن خالی بوتلیں اور ڈبے دلچسپی کا کیا سامان بہم پہنچاتے ہیں؟ بہت ممکن ہے آپ کو ذیل کے واقعات میں ان سوالوں کا جواب مل جائے۔

دس برس پہلے میں جب بمبئی گیا تو وہاں ایک مشہور فلم کمپنی کا ایک فلم تقریباً

میں ہفتوں سے چل رہا تھا۔ ہیروئن پرانی تھی، لیکن ہیرو نیا تھا جو اشتہاروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں تو خیر دکھائی دیتا تھا۔ اخباروں میں اسکی کردار نگاری کی تعریف پڑھی تو میں نے یہ فلم دیکھا۔ اچھا خاصا تھا۔ کہانی جاذبِ توجہ تھی اور اس نئے ہیرو کا کام بھی اس لحاظ سے قابلِ تعریف تھا کہ اس نے پہلی مرتبہ کیمرے کا سامنا کیا تھا۔

پردے پر کسی ایکٹر یا ایکٹریس کی عمر کا اندازہ لگانا عام طور پر مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ یک لخت جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیتا ہے، مگر یہ نیا ہیرو بلاشبہ نوخیز تھا۔ کالج کے طالب علم کی طرح تر و تازہ اور چاق و چوبند۔ خوبصورت تو نہیں تھا مگر اسکے گٹھے ہوئے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر مناسب و موزوں تھا۔

اس فلم کے بعد اس ایکٹر کے میں نے اور کئی فلم دیکھے۔ اب وہ منجھ گیا تھا۔ چہرے کے خط و خال کی طفلانہ نرمائش عمر اور تجربے کی سختی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا شمار اب چوٹی کے اداکاروں میں ہونے لگا تھا۔

فلمی دنیا میں اسکینڈل عام ہوتے ہیں۔ آئے دن سننے میں آتا ہے کہ فلاں ایکٹر کا فلاں ایکٹرس سے تعلق ہو گیا ہے۔ فلاں ایکٹرس فلاں ایکٹر کو چھوڑ کر فلاں ڈائریکٹر کے پہلو میں چلی گئی۔ قریب قریب ہر ایکٹر اور ہر ایکٹرس کے ساتھ کوئی نہ کوئی رومان جلد یا بدیر وابستہ ہو جاتا ہے، لیکن اس نئے ہیرو کی زندگی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ان بکھیڑوں سے پاک تھی۔ مگر اخباروں میں اس کا چرچا نہیں تھا۔ کسی نے بھولے سے حیرت کا بھی اظہار نہیں کیا تھا کہ فلمی دنیا میں رہ کر رام سروپ کی زندگی جنسی آلائشوں سے پاک ہے۔

میں نے سچ پوچھئے تو اس بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اس لئے کہ مجھے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی نجی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فلم دیکھا۔ اسکے متعلق اچھی یا بُری رائے قائم کی اور بس لیکن جب رام سروپ سے میری مُلاقات ہوئی تو مجھے اس کے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ یہ ملاقات اس کا پہلا فلم دیکھنے کے تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔

شروع شروع میں تو وہ بمبئی سے بہت دور ایک گاؤں میں رہتا تھا، مگر اب فلمی سرگرمیاں بڑھ جانے کے باعث اس نے شیواجی پارک میں سمندر کے کنارے ایک متوسط درجے کا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اس سے میری مُلاقات اسی فلیٹ میں ہوئی جس کے چار کمرے تھے، باورچی خانے سمیت۔

اس فلیٹ میں جو کنبہ رہتا تھا اس کے آٹھ افراد تھے۔ خود رام سروپ ساس کا نوکر جو باورچی بھی تھا، تین کتے۔ دو بندر اور ایک بلّی۔ رام سروپ اور اس کا نوکر مجرد تھے۔ تین کتوں اور ایک بلّی کے مقابلے میں ان کی مخالف جنس نہیں تھی۔ ایک بندر تھا اور ایک بندریا۔ دونوں اکثر اوقات ایک جالی دار پنجرے میں بند رہتے تھے۔

ان نصف درجن جیوانوں کے ساتھ رام سروپ کو والہانہ محبت تھی۔ نوکر کے ساتھ بھی اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ مگر اس میں جذبات کا دخل بہت کم تھا۔ لگے بندھے کام تھے۔ جو مقررہ وقت پر مشین کی سی بے روح باقاعدگی کے ساتھ گویا خود بخود ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام سروپ نے اپنے نوکر کو اپنی زندگی کے تمام قواعد و ضوابط ایک پرچے پر لکھ کر دیدیئے تھے جو اُس نے حفظ کر لئے تھے۔

اگر رام سروپ کپڑے اُتار کر، نیکر پہننے لگے تو اس کا نوکر فوراً تین چار سوڈے
اور برف کی فلاسک شیشے والی تپائی پر رکھ دیتا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ صاحب
رَم پی کر اپنے کتوں کے ساتھ کھیلیں گے اور جب کسی کا ٹیلیفون آئے گا تو کہہ
دیا جائے گا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

رَم کی بوتل یا سگریٹ کا ڈبہ جب خالی ہوگا تو اسے پھینکا یا بیچا نہیں
جائیگا بلکہ احتیاط سے اس کمرے میں رکھ دیا جائے گا جہاں خالی بوتلوں اور
ڈبوں کے انبار لگے ہیں۔

کوئی عورت ملنے کے لئے آئیگی تو اسے دروازے ہی سے یہ کہہ کر واپس
کر دیا جائے گا کہ رات صاحب کی شوٹنگ تھی، اس لئے سو رہے ہیں۔ ملاقات
کرنے والی شام کو یا رات کو آئے تو اس سے یہ کہا جاتا تھا کہ صاحب شوٹنگ
پر گئے ہیں۔

رام سروپ کا گھر تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ عام طور پر اکیلے رہنے والے تجرد
مردوں کا ہوتا ہے، یعنی وہ سلیقہ، قرینہ اور رکھ رکھاؤ غائب تھا جو نسائی
لمس کا خاصہ ہوتا ہے۔ صفائی تھی مگر اُس میں کھُردرا پن تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں اسکے
فلیٹ میں داخل ہوا تو مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ میں چڑیا گھر کے اس حصّے میں
داخل ہوگیا ہوں جو شیر، چیتے اور دوسرے حیوانوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔
کیونکہ ویسی ہی بو آ رہی تھی۔

ایک کمرہ سونے کا تھا۔ دوسرا بیٹھنے کا تیسرا خالی بوتلوں اور ڈبوں کا۔
اس میں رَم کی وہ تمام بوتلیں اور سگریٹ کے وہ تمام ڈبے موجود تھے جو رام سروپ

نے پی کر خالی کیے تھے۔ کوئی اہتمام نہیں تھا بوتلوں پر ڈبے اور ڈبوں پر بوتلیں اوندھی سیدھی پڑی ہیں۔ ایک کونے میں قطار لگی ہے تو دوسرے کونے میں انبار گرد جمی ہوئی ہے، اور باسی تمباکو اور باسی رم کی ملی جلی تیز بو آ رہی ہے۔

میں نے جب پہلی مرتبہ یہ کمرہ دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ ان گنت بوتلیں اور ڈبے تھے۔ سب خالی۔ میں نے رام سروپ سے پوچھا "کیوں بھئی یہ کیا سلسلہ ہے؟"

اس نے پوچھا "کیا سلسلہ۔؟"

میں نے کہا "یہ۔ کباڑ خانہ۔؟"

اس نے صرف اتنا کہا "جمع ہو گیا ہے۔!"

یہ سن کر میں نے بولتے ہوئے سوچا "اتنا!..... اتنا کوڑا جمع ہونے میں کم از کم سات آٹھ برس چاہئیں"

میرا اندازہ غلط نکلا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا یہ ذخیرہ پورے دس برس کا تھا۔ جب وہ شیواجی پارک رہنے آیا تھا تو وہ تمام بوتلیں اور ڈبے اٹھوا کے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ جو اسکے پرانے مکان میں جمع ہو چکے تھے۔ ایک بار میں نے اس سے کہا "سروپ تم یہ بوتلیں اور ڈبے بیچ کیوں نہیں دیتے؟۔ میرا مطلب ہے، اول تو ساتھ ساتھ بیچتے رہنا چاہئیں یہ اب کہ اتنا انبار جمع ہو چکا ہے اور جنگ کے باعث دام بھی اچھے مل سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں تمہیں یہ کباڑ خانہ اٹھوا دینا چاہیئے"

اس نے جواب میں صرف اتنا کہا "ہٹاؤ یار۔ کون اتنی بک بک کرے!"

اس جواب سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے خالی بوتلوں اور ڈبوں سے کوئی

دلچسپی نہیں، لیکن مجھے نوکر سے معلوم ہوا کہ اگر اس کمرے میں کوئی بوتل یا ڈبہ اِدھر کا اُدھر ہو جائے تو رام سروپ قیامت برپا کر دیتا ہے۔

عورت سے اِسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری اسکی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی باتوں باتوں میں میں نے کئی بار اس سے دریافت کیا "کیوں بھئی شادی کب کرو گے؟" اور ہر بار اس قسم کا جواب ملا "شادی کر کے کیا کروں گا؟" میں نے سوچا واقعی رام سروپ شادی کر کے کیا کریگا؟ کیا وہ اپنی بیوی کو خالی بوتلوں اور ڈبوں والے کمرے میں بند کر دیگا؟ یا سب کپڑے اُتار کر نیکر پہن کر رم پیتے اس کے ساتھ کھیلا کریگا؟ میں اس سے شادی بیاہ کا ذکر تو اکثر کرتا تھا مگر تصور پر زور دینے کے باوجود اسے کسی عورت سے منسلک نہ دیکھ سکتا۔

رام سروپ سے ملتے ملتے کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں کئی مرتبہ میں نے اُڑتی اُڑتی خبر سُنی کہ اسے ایک ایکٹرس سے جس کا نام شیلا تھا، عشق ہو گیا ہے۔ مجھے اس افواہ کا بالکل یقین نہ آیا۔ اوّل تو رام سروپ سے اس کی توقع ہی نہیں تھی دوسرے شیلا سے کسی بھی ہوش مند نوجوان کو عشق نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ اس قدر بیجان تھی کہ دق کی مریض معلوم ہوتی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ ایک دو فلموں میں آئی تو کسی قدر گوارا تھی مگر بعد میں تو وہ بالکل ہی بے کیف اور بے رنگ ہو گئی تھی۔ اور صرف تیسرے درجے کے فلموں کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے صرف ایک مرتبہ اس شیلا کے بارے میں رام سروپ سے دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر کہا "میرے لئے کیا ہی رہ گئی تھی!"

اس دوران میں اس کا سب سے پیارا کتا اسٹالن نمونیہ میں گرفتار ہو گیا۔

رام سروپ نے دن رات بڑی جانفشانی سے اس کا علاج کیا مگر وہ جانبر نہ ہوا۔ اسکی موت سے اسے بہت صدمہ ہوا کئی دن اسکی آنکھیں اشک آلود رہیں اور جب اس نے ایک روز باقی کتے کسی دوست کو دیدیئے تو میں نے خیال کیا کہ اس نے اشا ان کی موت کے صدمے کے باعث ایسا کیا ہے۔ ورنہ وہ اُن کی جُدائی کبھی برداشت نہ کرتا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اِس نے بندر اور بندریا کو بھی رخصت کر دیا تو مجھے کسی قدر حیرت ہوئی۔ لیکن میں نے سوچا کہ اس کا دل اب اور کسی کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ اب وہ نیکر پہنکر رَم پیتے ہوئے صرف اپنی بلّی نرگس سے کھیلتا تھا وہ بھی اس سے بہت پیار کرنے لگی تھی کیونکہ رام سروپ کا سارا التفات اب اسی کے لئے وقف ہو گیا تھا۔

اب اس کے گھر سے شیر، چیتوں کی بُو نہیں آتی تھی۔ صفائی میں کسی قدر نظر آجانے والا سلیقہ اور قرینہ بھی پیدا ہو چلا تھا، اسکے اپنے چہرے پر ہلکا سا نکھار آگیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ اس قدر آہستہ آہستہ ہوا تھا کہ اسکے نقطۂ آغاز کا پتہ چلانا بہت مشکل تھا۔

دن گذرتے گئے۔ رام سروپ کا تازہ فلم ریلیز ہوا تو میں نے اسکی کردار نگاری میں ایک نئی تازگی دیکھی۔ میں نے اسے مبارکباد دی تو وہ مُسکرا دیا۔ "لو وسکی پیو"

میں نے تعجب سے پوچھا "وہسکی؟" اس لئے کہ وہ صرف رَم پینے کا عادی تھا۔

پہلی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں ذرا سکیڑتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔

"رم پی پی کر تنگ آگیا ہوں"

میں نے اس سے اور کچھ نہ پوچھا۔

آٹھویں روز جب اِس کے ہاں شام کو گیا تو وہ قمیص پائجامہ پہنے' رم — نہیں وسکی پی رہا تھا۔ دیر تک ہم تاش کھیلتے اور وسکی پیتے رہے۔ اس دوران میں میں نے نوٹ کیا کہ وسکی کا ذائقہ اس کی زبان اور تالو پر ٹھیک نہیں بیٹھ رہا' کیونکہ گھونٹ بھرنے کے بعد وہ کچھ اس طرح منہ بناتا تھا جیسے کسی ان چکھی چیز سے اِسکا واسطہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"تمہاری طبیعت قبول نہیں کر رہی وسکی کو — ؟"

اُس نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "آہستہ آہستہ قبول کر لیگی"۔

رام سروپ کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ ایک روز میں اُدھر سے گذر رہا تھا کہ دیکھا نیچے گیراج کے پاس خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار پڑے ہیں سڑک پر دو چھکڑے کھڑے ہیں جن میں تین چار کباڑیئے ان کو لاد رہے ہیں' میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی' کیونکہ یہ خزانہ رام سروپ کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا تھا — آپ یقین جانئے اِس کو جُدا ہوتے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں ایک عجیب قسم کا درد محسوس کیا — دوڑا اوپر گیا گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھُلا۔ میں نے اندر داخل ہونا چاہا تو نوکر نے خلافِ معمول راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "صاحب رات شوٹنگ پر گئے تھے اس وقت سو رہے ہیں"۔

میں حیرت سے اور غصّے سے بوکھلا گیا — کچھ بڑبڑایا اور چل دیا۔

اسی روز شام کو رام سروپ میرے ہاں آیا — اِس کے ساتھ شیلا تھی' نئی بنارسی ساڑھی میں ملبوس — رام سروپ نے اُس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا۔ "میری

دھرم پتنی سے ملوٗ"

اگر میں نے وہسکی کے چار پیگ نہ پیے ہوتے تو یقیناً یہ سُنکر بیہوش ہو گیا ہوتا۔

رام سروپ اور شیلا صرف تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ بنارسی ساڑھی میں شیلا کس سے مشابہ تھی۔ دُبلے پتلے بدن پر ہلکے بادامی رنگ کی کاغذی سی ساڑھی۔ کسی جگہ پھولی ہوئی کسی جگہ دبی ہوئی۔ ایک دم میری آنکھوں کے سامنے ایک خالی بوتل آگئی، باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی۔

شیلا عورت تھی۔ بالکل خالی، لیکن ہو سکتا ہے ایک خلا نے دوسرے خلا کو پُر کر دیا ہو۔

ختم شُد

۱۴۶ مشہور ناول
جو اب تک شائع ہو چکے ہیں

ناول		بھنور	ٹھاکر پونچھی	وصیت	دت بھارتی
بورن کلب	کرشن چندر	جب پتھر روتے ہیں	״	بھولنے والے	زلیخا حسین
دادر پل کے بچے	״	اداس تنہائیاں	״	ضیابہ	״
غدار	״	پت جھڑ کے بچھڑے	״	آپا	״
مسافر	کرشن گوپال عابد	یہ رشتے یہ روگ	״	میرے صنم	״
دھرتی کے پھول	״	چاندی کے ہاتھ	״	آخری رات	اختر عادل روپ
پوجا	״	کلیوں کا مزار	״	پھول اور تنہائی	״
ایک ہنسی ہزار آنسو	״	لاجی نیکا	عادل رشید	چینی رقاصہ	وحشی محمود آبادی
بوند اور سمندر	״	بربط کے تار	״	انجانے راستے	״
آشیانہ	امرتا پریتم	بساطِ دل	״	بکھر گئے سپنے	نظمی صدیقی
بند دروازہ	״	چاندنی	״	تیری صورت میری آنکھیں	״
بڑی دیدی	شرت چندر	چندرما	״		مہندر ناتھ
سراج بہو	״	چندن ہار	״	منزل ایک مسافر دو	״
زخم	الیاس احمد گدی	روٹھا طوفان	سعید امرتسری	ایک شمع ہزار پروانے	״

غم کی چھاؤں میں
ثریا محمود ندرت
طوفان سے ساحل تک ،،
خزاں کے پھول اقبال جاوید
نگینہ عابدہ حجاب لکھنوی
کشور نسیم انہونوی
گمراہ مضطر ہاشمی
روٹھی بہار حسین علوی
راز عارف مارہروی
خواب ،،
دور کنارہ نانک سنگھ
روح کا انتقام جمیل انجم
راوی کی روح ،،
ریشماں ذکی انور

جاسوسی ناول

سیاہ پتھر عارف مارہروی
پھانسی کا تختہ مخمور جالندھری
موت کی آغوش میں ،،
رخسار کا زخم ،،

دی اکرم الہ آبادی
ابوالہول کی روح ،،
بلیک میلر ،،
ریڈیائی دھماکے ،،
فورٹ کرناک ،،
وادیٔ نور ،،
منحوس ستارہ ،،

افسانے

دیوتا اور کسان کرشن چندر
مسکراتی ڈالیاں ،،
کرشن چندر کے افسانے ،،
ہوائی قلعے ،،
منٹو کی بہترین کہانیاں منٹو
شکاری عورتیں ،،
چغد ،،
کالی شلوار ،،
منٹو کے افسانے ،،
ٹھنڈا گوشت ،،
ایک لڑکی ایک جام امرتا پریتم

لکشمی کرشن گوپال عابد
ساگر اور لہریں ،،
ناگن زلفیں سعید امرت

مختلف مضامین کی چند کتب

برتھ کنٹرول ڈاکٹر وشیو داس
صحت اور تندرستی ،،
گیتانجلی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور
منٹو میرا دوست
ڈاکٹر کیول دھیر
غالب کے خطوط غالب
لغات المشورہ نظمی صدیقی
منٹو اور فلمی شخصیتیں منٹو
خود تشخیص کیا چاہتا ہے؟
خواجہ احمد عباس
رہنمائے فوٹوگرافی ڈی آر آنند
فلمی نغمے نظمی صدیقی
تخلیقات خلیل جبران
خلیل جبران

اسلامی کتب

بہشتی زیور حصہ ۱ تا ۳	
" " ۴ تا ۶	
" " ۷ تا ۹	
" " ۱۰ و ۱۱	
مولانا اشرف علی تھانویؒ	
سرکارِ دوعالم	راشد سہوانی
نعتِ رسول	رضی بدایونی
تعلیماتِ رسول	"
سیدہ کا لال	راشد الخیری

شاعری

کلیاتِ اکبر	اکبر الٰہ آبادی
کلامِ بے لگام	ناشاد دہلوی
شکنتلا میگھ دوت	
مہاکوی کالی داس	
قاشیں	نریش کمار شاد
دو آتشہ	"
آج کے اردو شاعر اور ان کی شاعری۔	پرکاش پنڈت

کلیاتِ اختر شیرانی	
	اختر شیرانی
دیوانِ غالب عکسی رنگین	غالب
دیوانِ غالب سادہ	"
دیوانِ ظفر عکسی رنگین	ظفر
دیوانِ ظفر سادہ	"
رباعیاتِ عمر خیام حصہ اول	
" دوم	"
" سوم	"
	پروفیسر واقعت
کلیاتِ اقبال	اقبال
کلامِ اقبال	"
بالِ جبریل	"
بانگِ درا	"
ضربِ کلیم	"
ارمغانِ حجاز	"
دیوانِ داغ	داغ
دیوانِ ذوق	ذوق
دیوانِ مومن	مومن

دیوانِ درد	خواجہ میر درد
کلامِ میر	میر تقی میر
کلامِ فانی	فانی
کلامِ امیر مینائی	امیر مینائی
کلامِ حالی	حالی
مسدسِ حالی	"
انتخابِ نظیر	نظیر اکبر آبادی
انتخابِ سودا	سودا
رباعیاتِ حافظ شیرازی	
جذبات	
بھگوت گیتا منظوم	
	منور لکھنوی
رامائن منظوم	اشک ایم۔اے
شاہنامہ فردوسی	
	وحشی محمود آبادی
شاہنامہ اسلام	حفیظ جالندھری

ڈرامے

ہیملٹ	شکسپیر
رومیو جولیٹ	"

نیا سیٹ

۱۳۷ - کلیاتِ اختر شیرانی — اختر شیرانی

۱۳۸ - راہی — دت بھارتی

۱۳۹ - نغمہ اور زندگی — امرتا پریتم

۱۴۰ - شیر افگن — وحشی محمود آبادی

۱۴۱ - راہ گذر — مغنی الدین صدیقی

۱۴۲ - وینس کا سوداگر — شکسپیئر

۱۴۳ - مقناطیسی طوفان — اکرم الہ آبادی

۱۴۴ - خالی بوتلیں خالی ڈبے — منٹو

۱۴۵ - قسمت کا حال - شیو ناتھ رائے سکین

۱۴۶ - اسلامی مسائل - رضی بدایونی

قیمت فی کتاب ایک روپیہ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ نئی مشورہ پاکٹ بکس شائع ہوتے ہی آپکو اطلاع ملتی رہے تو آپ اپنا پتہ لکھ بھیجئے۔ ہم آپکو اس بارہ میں ضروری اطلاع دیتے رہیں گے۔

مشورہ بکڈپو

رام نگر گاندھی نگر پوسٹ بکس ۱۶۳۹ دہلی ۶

مشورہ بکس

1/-

اردو کی اوّلین پاکٹ بکس